مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
مؤلفہ
فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذی نور اللہ مرقدہ
بانی جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا
www.alhaqqania.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم
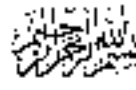
مقام رسول کریم ﷺ

کتاب وسنت کی روشنی میں

مؤلفہ

فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذی نوراللہ مرقدہ
بانی جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

ناشر
جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا
048-6785002/6785899

نام کتاب — مقام رسول کریم ﷺ کتاب وسنت کی روشنی میں

مؤلف — فقیہ العصر مفتی سید عبد الشکور ترمذی نور اللہ مرقدہ

کمپوزنگ — حقانیہ کمپوزنگ سنٹر

ناشر — جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

تعداد — گیارہ سو

ملنے کے پتے

مولانا محمد آصف چنیوٹی مدرس جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

0300-7718141 / 0342-7736235

مکتبہ عائشہ حق اسٹریٹ اردو بازار لاہور 0300-9233714

چنیوٹی کتب خانہ محلہ گڑھا چنیوٹ 0321-7702845

مدرسہ مدینۃ العلوم مقام حیات سرگودھا 0300-6008924

ناشر

جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

048-6786002

حرف اولین

از قلم: حضرت مولانا مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم
مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

بعد الحمد والصلوٰۃ: کافی عرصہ پہلے ''مقام رسول کریم ﷺ'' کے نام سے حضرت اقدس والد ماجد قدس سرہ نے ایک مضمون بدر العلماء حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عظیم و شہرۂ آفاق کتاب ''ترجمان السنہ'' کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا تھا جسے اس وقت ملک کے مشہور و معروف جریدہ ''ماہنامہ الحق'' نے شائع کیا۔ سالہا سال کے بعد جامعہ حقانیہ کے ترجمان ''مجلہ الحقانیہ'' نے بھی اسے کئی قسطوں میں شائع کیا۔

احقر کا عرصہ سے تقاضہ تھا کہ اسے مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ اس کی افادیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکے اس ضرورت کو برادر عزیز مولوی محمد آصف چنیوٹی سلمہ اللہ تعالیٰ نے محسوس کر لیا اور اسے اب آب و تاب کے ساتھ الگ شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور دارین میں اس کا نفع عطا فرمائیں، مضمون اپنی عظمت و جامعیت کے اعتبار سے نہایت درجہ عظیم الشان اور گوناگوں محاسن کا حامل ہے عوام و خواص، طلباء و طالبات سب کے لیے مفید ہے امید ہے کہ سب ہی اس کی قدردانی کریں گے، واللہ الموفق والمعین۔

فقط احقر عبدالقدوس ترمذی غفرلہ
جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا
۲۵ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

مختصر حالات

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبد الشکور ترمذی قدس سرہ فاضل دار العلوم دیوبند
بانی جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

ولادت باسعادت

آپ کی ولادت موضع اڑدن ریاست پٹیالہ ہندوستان میں ۱۱ر رجب المرجب ۱۳۴۱ھ بمطابق مارچ ۱۹۲۳ء کو ہوئی، عبدالشکور آپ کا نام رکھا گیا بعد میں تاریخی نام مرغوب النبی نکالا گیا۔

تعلیم وتربیت

آپ نے قاعدہ مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح ضلع گڑگانواں میوات کے علاقہ میں پڑھا، یہ مدرسہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بنایا تھا، ابتدائی نوشت وخواند کے بعد اردو، ناظرہ قرآن پاک، حساب کی تعلیم مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں ہوئی اور قرآن کریم اسی مدرسہ میں خلیفہ حافظ اعجاز احمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے حفظ کیا۔

سفر حجاز

حفظ کے بعد فارسی کتب والد ماجد حضرت مفتی عبدالکریم گمتھلوی رحمہ اللہ سے پڑھیں، پھر جب ۱۳۵۶ھ ۱۹۳۸ء میں والد ماجد حج کے لیے حجاز تشریف لے گئے تو آپ بھی ہمراہ تھے، آٹھ ماہ آپ کا قیام مدینہ منورہ میں ہوا، وہاں آپ نے ابتدائی عربی کتب والد ماجد سے پڑھنے کے علاوہ حضرت قاری اسعد صاحب رحمہ اللہ وغیرہ سے

قرآن کریم کی مشق کی اور کتب تجوید پڑھیں ، شیخ القراء قاری حسن شاعر رحمہ اللہ مسجد نبوی میں مقدمۂ جزریہ پڑھاتے تھے آپ اس میں بھی شریک ہوتے ، حجاز سے واپسی ۱۳۵۸ھ بمطابق ۱۹۳۹ء میں دوسرے حج کے بعد ہوئی ۔

عربی تعلیم

حجاز سے واپسی پر قصبہ راجپورہ ریاست پٹیالہ کے ''عربی مدرسہ'' میں مولانا سمیع اللہ خان رحمہ اللہ برادر حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان رحمہ اللہ سے ابتدائی عربی کتابیں پھر انبالہ چھاؤنی کے ''مدرسہ معین الاسلام'' میں مولانا محمد متین رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد مبین رحمہ اللہ صاحب سے کتب عربیہ متوسط پڑھیں ۔

سبعہ قراءات مع ثلاثہ

انبالہ چھاؤنی کے زمانہ تعلیم میں شاطبیہ حضرت والدصاحب سے پڑھی بعدازاں شیخ القراء مولانا قاری ابومحمد محی الاسلام عثمانی رحمہ اللہ کی خدمت میں پانی پت حاضر ہوکر حضرت مولانا موصوف کو سارا قرآن کریم بطریق جمع الجمع سنایا اور نقل بھی کیا اور شاطبیہ بھی دوبارہ پڑھی ، اس کے بعد امام القراء قاری فتح محمد صاحب عزیز رحمہ اللہ سے ''الدرۃ المضیۃ'' پڑھی اور ''شاطبیہ'' کا بعض حصہ اور ''مقدمہ جزریہ'' پورا سنایا پھر بزمانہ قیام دارالعلوم دیوبند حضرت قاری حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشق کی اور ''طیبۃ النشر'' کا بعض حصہ پڑھا ۔

تکمیل علوم

پانی پت سے فراغت کے بعد آپکے والدماجد رحمہ اللہ نے آپ کو شاہ آباد ضلع کرنال مدرسہ حقانیہ میں اپنے پاس بلالیا اور حسامی ، شرح وقایہ ، ہدایہ اولین ، قطبی

وغیرہ کتب خود پڑھائیں، شوال ۱۳۶۲ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا مگر عیدالاضحی کے بعد ۱۹۴۴ء میں مدرسہ قاسم العلوم فقیروالی ضلع بہاولنگر چلے گئے اس وقت وہاں آپ کے والد محترم صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے، آپ نے جلالین والد ماجد سے اور ہدایہ اخیرین، مشکوٰۃ شریف، منطق کے دیگر اسباق مولانا ظہور احمد صاحب رحمہ اللہ سابق مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھے، شوال ۱۳۶۳ھ میں آپ کا داخلہ دارالعلوم دیوبند میں ہوا وہاں آپ دو سال زیر تعلیم رہے پہلے سال مطول، شرح العقائد، ملاحسن، بیبذی وغیرہ کتب حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک حضرت مولانا عبدالخالق، حضرت مولانا فخرالحسن، مولانا محمد جلیل صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھ کر اگلے سال شوال ۱۳۶۴ھ بمطابق ۱۹۴۵ء میں دورۂ حدیث شریف میں داخل ہوئے اور شعبان المعظم ۱۳۶۵ھ ۱۹۴۶ء میں فراغت پائی۔

دورۂ حدیث شریف میں ترمذی شریف حضرت مدنیؒ نے شروع کرادی تھی کہ وہ اس کے بعد تین ماہ کی رخصت پر تشریف لے گئے، آپ کی جگہ حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادی رحمہ اللہ تقریباً تین ماہ سہ ماہی تک ترمذی شریف اور بخاری شریف کا درس دیتے رہے اس عرصہ میں ترمذی کی کتاب الصلاۃ اور بخاری شریف کی کتاب العلم ختم ہوگئی تھی پھر حضرت مدنی قدس سرہ تشریف لے آئے، آپ نے ترمذی جلد اول اور بخاری کی ہر دو جلد مکمل کرائیں ترمذی شریف کی جلد ثانی اور شمائل ترمذی حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ نے پڑھائی مسلم، ابوداود، نسائی، طحاوی، مؤطا امام مالک علی الترتیب حضرت مولانا بشیر احمد گلاؤٹھی، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، حضرت مولانا فخرالحسن، حضرت مولانا عبدالحق، حضرت مولانا عبدالخالق رحمہم

اللہ تعالٰی سے اور ابن ماجہ، وموطا امام محمد دیگر اساتذہ کرام سے پڑھیں۔

تربیت باطنی وسلوک

آپ طالب علمی کے زمانہ میں ہی بڑی پیرانی صاحبہ رحمہا اللہ تعالٰی کی سفارش پر حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی قدس سرہ سے بیعت ہو گئے تھے، چودہ سال کی عمر تک حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ کے زیر سایہ تھانہ بھون ہی میں آپ کا قیام رہا، حکیم الامت رحمہ اللہ کی وفات کے وقت آپ کی عمر اکیس سال تھی آخر تک حضرت سے تعلق رہا، جمادی الاولی ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں مظاہر علوم سہارنپور کے جلسہ میں شرکت کے بعد آپ اپنے والد ماجد اور عم محترم جناب عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ تعالٰی کے ساتھ حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے خصوصی شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا اور از خود تحریک فرما کر چچا محترم کی لڑکی سے نکاح بھی پڑھایا حضرت کی وفات کے بعد اصلاحی تعلق حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ سے رہا پھر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمہ اللہ سے اور پھر حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے رہا، ان کی وفات کے بعد حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ سے۔ حضرت علامہ عثمانی اور حضرت مفتی اعظم قدس سرہما نے آپ کو اجازت بیعت سے بھی نوازا۔

علمی خدمات اور ہجرت پاکستان

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے کچھ عرصہ راجپورہ ریاست پٹیالہ کے مدرسہ میں تدریس کا کام کیا، اس کے بعد مدرسہ حقانیہ شاہ آباد ضلع کرنال میں مدرس ہو گئے اور کنز، شرح جامی وغیرہ تک کتابیں پڑھائیں۔

تقسیم ملک کے بعد یکم فروری ۱۹۴۸ء کو ساہیوال ضلع سرگودھا صوبہ پنجاب میں قیام ہوا، یہاں تعلیم و تبلیغ، تصنیف وافتاء اور تدریس کی عظیم الشان خدمات انجام دیں، یہاں آپ نے پہلے مدرسہ قاسمیہ کے نام سے شہر کی قدیم مسجد شہابی میں ایک مدرسہ قائم کیا، حفظ و ناظرہ کے علاوہ مشکوٰۃ تک کتابیں بھی آپ پڑھاتے رہے، ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک چلی تو تین چار ماہ آپ جیل میں رہے جس کی وجہ سے مدرسہ بند ہوگیا، پھر آپ نے ۱۹۵۵ء میں نئی جگہ پر مدرسہ حقانیہ کے نام سے دینی ادارہ کی بنیاد رکھی جو تعمیر و تعلیم کے لحاظ سے بحمداللہ خوب رو بترقی ہے، اس وقت مدرسہ میں طلبہ وطالبات کی تعداد سات صد سے متجاوز ہے، مقیم طلباء سو سے زائد ہیں، حفظ و ناظرہ کے علاوہ طلبہ وطالبات کے لیے درس نظامی مع دورۂ حدیث شریف کا بھی انتظام ہے، علاوہ ازیں علماء کرام اور فضلاء درس نظامی کے لیے درجہ تخصص فی الفقہ کی تعلیم کا بھی انتظام ہے جس میں انہیں دو سال تک افتاء کی تربیت دی جاتی ہے۔

۱۹۶۰ء میں مسجد حقانیہ کے نام سے آپ نے ایک عظیم مسجد کا سنگ بنیاد بھی رکھا جو اس وقت علاقہ کی بڑی مساجد میں شمار ہوتی ہے، عید گاہ حقانیہ کی زمین اس کے علاوہ ہے جس پر عید کی نماز ادا کی جاتی ہے، مسجد زینب کے نام سے دو منزلہ جامع مسجد بھی الگ تعمیر ہو چکی ہے اس کے ساتھ جامعہ کی شاخ بھی ہے جس میں قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مزید توسیع کے لیے تقریباً ۱۴ کنال زمین الگ بھی خرید لی گئی ہے اس میں فی الحال دو مدرس قرآن کریم کی تعلیم دے رہے ہیں، ساہیوال شاہپور روڈ پر بھی تین

کنال جگہ میں مسجد اور مدرسہ کی تعمیر زیر غور ہے ،مدرسۃ البنات کی عمارت اس کے علاوہ ہے جس میں دورہ حدیث تک درس نظامی پڑھایا جاتا ہے۔

جامعہ کے شعبہ دارالافتاء سے کئی ہزار تحریری فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں جس میں تقریباً دس ہزار فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ ہے ان پر تحقیق وتبویب کا سلسلہ جاری ہے ،آپ کے ان فتاویٰ کا نام ''امداد السائل فی الاحکام والمسائل'' رکھا گیا ہے۔

تصنیف وتالیف

حضرت مفتی صاحب نے تصنیف وتحریر کا عظیم سلسلہ بھی بڑی محنت سے جاری رکھا اور بہت سی گرانقدر کتب تحریر فرمائیں ،اس وقت آپ کی تصنیفات ، رسائل مقالات ومضامین کی تعداد ۲۰۰ سے متجاوز ہے ان میں بعض تصنیفات کے نام یہ ہیں :

(۱)تکملہ احکام القرآن للشیخ محمد ادریس کاندھلوی (۲)تکملہ احکام القرآن للعلامۃ الشیخ ظفر احمد عثمانی (۳)تتمۃ البیان فی ترجمۃ القرآن(۴)اشرف البیان فی علوم القرآن (۵)ہدایۃ الحیران فی جواہر القرآن(۶)تقریر ترمذی شریف (۷)خلاصۃ الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد(۸)ادراک الفضیلۃ فی الدعاء بالوسیلۃ(۹)اسلامی حکومت کا مالیاتی نظام(۱۰)شخصی ملکیت اور اسلام (۱۱) دعوت وتبلیغ کی شرعی حیثیت (۱۲)حیات انبیاء کرام علیہم السلام (۱۳)مجموعہ فتاویٰ امداد السائل فی الاحکام والمسائل(۱۴) گاؤں میں جمعہ کا شرعی حکم (۱۵)گستاخ رسول ﷺ اور مرتد کی شرعی سزا (۱۶)عورت کی سربراہی اور اسلام (۱۷) تحریک پاکستان کی شرعی حیثیت (۱۸)عقائد علماء دیوبند (۱۹)رؤیت ہلال کی شرعی حیثیت (۲۰)فضائل جہاد(۲۱)تذکرۃ الظفر (۲۲)تذکرہ شیخ

الاسلام حضرت مدنی (۲۳)معارف حضرت مدنی (۲۴)تذکرۃ الشیخ محمد زکریا کاندھلوی (۲۵)اشرف المعارف (۲۶)حضرت افغانی کی تفسیری خدمات (۲۷)حضرت مفتی اعظم کی تفسیری خدمات (۲۸)تاریخ مدارس دینیہ (۲۵)دینی مدارس اوران کا نصاب تعلیم (۳۰) نفاذ شریعت بل اسمبلی کی ذمہ داری اورعلماء کا کردار (۳۱)ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے نظریات پر ایک تحقیقی نظر (۳۲) محمود احمد عباسی کے نظریات پر تحقیقی نظر (۳۳) تفسیر ترجمان القرآن اور ابوالکلام کے نظریات پر ایک نظر وغیرہ۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی عظیم عبقری شخصیت اپنے دور میں اسلاف کی یادگار اور مغتنمات دہرمیں سے تھی ،اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہرو باطن کا جامع بنایا تھا آپ نے جہاں وقت کے اکابر اولوالعلم والفضل اور نابغۂ روزگار شخصیات سے اکتساب فیض کیا وہیں وقت کے مجدد اور حکیم الامت سے فیض باطنی حاصل کرنے کی سعادت بھی پائی ۔

محدث جلیل حضرت مولانا علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ صاحب اعلاء السنن ، مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، مخدوم العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، فقیہ ملت حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی قدس سرہم جیسی عظیم ہستیوں کو آپ پر ہمیشہ اعتماد رہا، اہل علم میں آپ کی تصنیفات و تحقیقات اور ارباب فتاویٰ میں آپ کے وقیع فتاویٰ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

مسلک دیوبند اور بطور خاص مسلک اشرفی کی ترجمانی میں آپ کو صف اول کے علماء میں شمار کیا جاتا ہے،غرضیکہ آپ کی علمی ، فقہی ، تصنیفی ،تدریسی خدمات کے پیش نظر صرف جامعہ حقانیہ ساہیوال اور علاقہ ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں آپ کا

فیض جاری ہے ، ضعف اور بیماری نیز کبر سنی کے عالم میں بھی آپ دینی خدمات بڑی تندہی سے انجام دیتے رہے۔

جامعہ حقانیہ کے علاوہ کئی دوسرے دینی مدارس کی بھی آپ سرپرستی اور اہتمام و رہنمائی فرماتے رہے ، دینی ادارے اور ملک کے کئی بڑے جامعات کی شوریٰ میں بھی آپ شامل رہے۔

سانحہ وفات

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ساری زندگی دینی، علمی ، فقہی خدمات میں گزاری اور ۵ رشوال المکرم ۱۴۲۱ھ بروز سوموار یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو انتقال فرمایا، اگلے روز آپ کا جنازہ حضرت مولانا مشرف علی تھانوی مدظلہم نے پڑھایا، ہزاروں افراد نے اس میں شرکت کی اور عصر سے قبل حقانیہ قبرستان ساہیوال سرگودھا میں آپ کی تدفین ہوئی ، نور اللہ مرقدہ سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ ومأواہ، آمین۔

حضرت اقدس رحمہ اللہ کے بالواسطہ اور بلاواسطہ ہزاروں تلامذہ ، مدارس اور آپ کی وقیع علمی تصنیفات وفتاویٰ آپکے لیے بہترین صدقہ جاریہ اور باقیات صالحات ہیں ، بطور خاص مدرسہ جامعہ حقانیہ ، جامع مسجد حقانیہ ، عیدگاہ حقانیہ آپ کی عظیم یادگار ہیں، حق تعالیٰ ان کو ہمیشہ قائم رکھیں اور حضرت کے درجات کو بلند فرمائیں ، آمین۔

تفصیلی حالات کیلئے کتاب ''حیات ترمذی'' مؤلفہ مفتی سید عبدالقدوس ترمذی صاحب مدظلہم مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا کا مطالعہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور ترمذی قدس سرہ

مقام رسالت ونبوت کی صحیح پہچان نہ ہونے اور اس کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے دیکھا جارہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حقوق اطاعت ومحبت اور عظمت وغیرہ میں اکثر کوتاہی برتی جارہی ہے اور ان برگزیدہ ہستیوں کے بارہ میں طرح طرح کے افراط وتفریط سے کام لے کر ان کی حق تلفی کی جارہی ہے، یہاں تک کہ ایک گروہ نے تو ان حضرات کو عام انسانوں کی سطح پر لاکھڑا کرنے کی کوشش میں انتہا کردی، ان کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ جتنی کہ ایک پیغام پہنچانے والے انسان اور چٹھی رساں کی ہوتی ہے (العیاذ باللہ) اور دوسرے گروہ نے ان حضرات کے ذاتی کمالات اور فطری خصوصیات کو دیکھ کر ان کی بشریت کے واضح اور صاف قرآنی مسئلہ کو ایسا الجھا دیا کہ گویا وہ اس سے انکاری ہے اور اس کے نزدیک مقام رسالت اور بشریت میں منافات اور تضاد ہے۔

زیر نظر مقالہ اس غرض سے ترتیب دیا گیا ہے کہ مقام رسالت سے متعلق متذکرہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی اور اصلاح ہو اور انبیاء علیہم السلام کے حقوق وآداب کے بارہ میں افراط وتفریط سے بچ کر راہ اعتدال اور مسلک حق واضح ہوجائے۔

یہ مضامین بڑے عمدہ پیرائے بیان کے ساتھ ''ترجمان السنۃ'' میں موجود ہیں مگر چونکہ وہ کسی ایک مقام پر مرتب شدہ شکل میں نہیں تھے بلکہ ''ترجمان السنۃ'' کی ضخیم جلدوں میں سینکڑوں صفحات اور متفرق مقامات پر بکھرے ہوئے تھے اس

لیے مرتب نے وہاں سے ہی منتشر مضامین کو مختلف مقامات سے ایک عنوان کے تحت جمع کرنے کی محنت و سعی کی ہے تاکہ ان منتشر اور متفرق مضامین سے ناظرین سہولت کے ساتھ استفادہ کرسکیں اور جگہ جگہ سے اتنی ضخیم کتاب کی ورق گردانی کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

مرتب نے چونکہ صرف عبارات کے نقل اور جمع کرنے کی خدمت ہی انجام دی ہے اس لیے اس مقالہ کی خوبیوں اور اس کے محاسن میں مرتب کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ''ترجمان السنۃ'' کے مصنف ہی کا فیض ہے اور اس کے محاسن کا شمار مصنف ہی کے حسنات میں ہونا چاہیے۔

البتہ مقالہ کی ترتیب کیلئے ''ترجمان السنۃ'' کی عبارت میں بہت جگہ حذف وزیادت اور اضافہ و ترمیم بھی کیا گیا ہے اور اس طرح اصل عبارت میں بہت جگہ تغیر ہوگیا ہے اس لیے ناظرین کو اگر کسی جگہ مقالہ کے مضامین میں بے ربطی اور کوئی خلا نظر آئے یا کسی قسم کا اشتباہ محسوس ہو تو اس کو مصنف علامہ کی طرف منسوب نہ کیا جائے بلکہ اس کو مرتب کی نظر و فکر کی کوتاہی تصور کیا جائے اور مرتب کو مطلع فرما کر ممنون فرمایا جائے۔ فقط

(مرتب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین والصلٰوۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ اٰلہ واصحابہ اجمعین۔

واضح رہے کہ ایمان کا ایک رکن اعظم انبیاء علیہم السلام کو ماننا اور ان پر ایمان لانا بھی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا انکار کفر ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک فرد کا یا اجمالاً ان کی جنس کا انکار بھی کفر ہے۔

مدار نجات

معلوم ہونا چاہیے کہ مدار نجات ایمان باللہ اور ایمان بالمغیبات ہے اور مغیبات سے مراد قیامت، فرشتے، جنت ودوزخ وغیرہ ہیں، انبیاء علیہم السلام انہی امور کی تعلیم وتشریح کیلئے تشریف لائے ہیں۔

ایمان بالرسول ﷺ اصل اصول ہے

اور چونکہ ان غائب اور غیر محسوس مغیبات پر انبیاء علیہم السلام کے واسطہ کے بغیر ایمان میسر نہیں آسکتا اس لیے ان پر ایمان لانے سے بھی پیشتر انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا لازم ہوتا ہے، اسی طرح ایمان بالرسول ﷺ جو درحقیقت ایمان باللہ کا ایک ذریعہ تھا اب ایک حیثیت میں رکن رکین اور اصل الاصول بن جاتا ہے، اسی لیے یہ مسئلہ کسی اختلاف کے بغیر ہمیشہ مسلمہ چلا آرہا ہے کہ ایمان کیلئے خداتعالیٰ کی توحید اور رسول ﷺ کی رسالت کی تصدیق دونوں ہی اجزاء لاینفک ہیں، اس وقت ہماری غرض یہ ہے کہ شرائع سماویہ میں رسولو ل پر ایمان لانا بھی ہمیشہ توحید الٰہی کے برابر کا جزء سمجھا گیا ہے اور آسمانی مذہب میں سے کسی ایک مذہب میں

بھی صرف خداتعالیٰ کی توحید کو مدار نجات نہیں سمجھا گیا۔

کسی رسول کی دعوت پہنچ جانے کے بعد کوئی شخص رسول پر ایمان لانے سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا، قرآن وحدیث کے تواتر سے یہ ثابت ہے کہ رسولوں کی تصدیق نجات ابدی کیلئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ خداتعالیٰ کی توحید، اس میں کسی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کا ارشاد

امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت عقلاً تمام مخلوق پر واجب ہے اور انبیاء علیہم السلام کے بغیر اس معرفت کا حاصل ہونا ناممکن ہے اس لیے نبوت ورسالت کا انکار درحقیقت حق تعالیٰ کی ذات پاک کا ہی انکار ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وماقدروااللہ حق قدرہ اذقالواماانزل اللہ علیٰ بشر من شیء انہوں نے حق تعالیٰ کے کمالات کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہی نہیں لگایا جبکہ یہ کہا کہ اس نے کسی بشر پر کتاب ہی نازل نہیں فرمائی۔

یعنی جب یہ لوگ رسولوں پر شریعت کے نزول کا انکار کرتے ہیں تو گویا خداتعالیٰ کی جانب سے رسالتیں کا انکار کرتے ہیں اور رسالت کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو خداتعالیٰ کی صفات اور اس کے کمالات کی برتری کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکا۔

اقوام عالم پر نظر

آج دنیا کی اقوام پر نظر ڈال لیجے آپ کو ثابت ہوجائے گا کہ جو قوم نبوت ورسالت کی منکر ہوئی ہے اس کو پھر خدائی معرفت میں کوئی حصہ نصیب نہیں ہوا بلکہ

جوقوم رسولوں کی معرفت میں جتنی پیچھے رہ گئی ہے وہ اتنی ہی خداتعالی کی معرفت میں بھی پیچھے رہ گئی۔

آج نصاری جوعقلاء زمانہ کہلاتے ہیں جب انہوں نے اپنے رسول کے صحیح مقام کو پہچاننے میں ٹھوکر کھائی تو پھر دیکھ لیجیے کہ خداتعالی کی معرفت میں ہی ان کا حصہ کتنا رہا، یہاں تک کہ توحید فی التثلیث کا بنیادی مسئلہ بھی ان کے نزدیک تقدیر کی طرح مذہب کا ایک راز بن کر رہ گیا۔

اس کے بالمقابل امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ ہے کہ جب وہ اپنے رسول ﷺ کا صحیح مقام پہچاننے میں پیش گام رہی تو اس کو اپنے رب کی معرفت کا جام بھی سب سے بھرپور نصیب ہوا، اس لیے یہ امت تمام امتوں پر فوقیت لے گئی ہے۔

آیت بالا کی روشنی میں یہ فیصلہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی رسالت کا اعتراف نہیں کرتے اور صرف توحید کے قائل ہیں کیا ان کو صحیح معنی میں توحید اور ایمان بالغیب نصیب ہوسکتا ہے۔ اسی لیے امام موصوف فرماتے ہیں من انکر النبوۃ والرسالۃ فھو فی الحقیقۃ ما عرف اللہ عزوجل (تفسیر ابن کثیر ص ۲۸۱ ج ۳) جس نے نبوت و رسالت کا انکار کیا در حقیقت وہ اللہ تعالی کی ذات پاک کی معرفت ہی سے بے نصیب ہے۔

ضروریات دین

اسی طرح اللہ تعالی کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور قیامت کے انکار کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے، یعنی توحید کی طرح ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کا دین محمدی میں ہونا اتنا روشن ہوجائے کہ محتاج دلیل نہ رہے ان سب کا ماننا ایمان کے لیے ضروری ہے، اسی کو ضروریات دین کہا جاتا ہے مثلاً فرائض خمسہ، آنحضرت ﷺ کا خاتم النبیین ہونا، عذاب قبر، قرآن کریم وغیرہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جس کے ثبوت میں دلائل کی حاجت نہیں بلکہ ان چیزوں کا دین اسلام میں داخل ہونا عام طور پر سب کو معلوم ہے، اس لیے ان میں سے کسی ایک کا انکار اسی طرح کفر ہوگا جیسا کہ توحید و رسالت کا انکار کفر ہے۔

جس طرح ایمان میں اللہ اور رسول کے درمیان فرق کی گنجائش نہیں، ایک کا منکر دوسرے کا منکر سمجھا جاتا ہے اسی طرح رسولوں میں بھی باہمی یہی نسبت موجود ہے یعنی کسی ایک رسول کا انکار کرنا دوسرے کا انکار اور کفر ہے۔ اب آیات ذیل کو پڑھیے:

(۱) انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ مومن دراصل وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔

(۲) ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلا اولٰئک ھم الکافرون حقا جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے منکر ہوئے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کس پر ایمان لائیں گے اور کس کا انکار کریں گے الخ۔ یہی لوگ اصل کافر ہیں۔

(۳) ومن یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر

فقد ضل ضلالاً بعیدا جوانکار کرے اللہ کااوراس کے فرشتوں کااور رسولوں اور قیامت کے دن کاوہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

پہلی آیت میں اللہ اوراس کے رسولوں پر بلاتفریق ایمان لانے کاحکم ہے، دوسری آیت میں ان کے درمیان فرق کرنے والے کواصل کافر کہاگیاہے اور تیسری آیت میں ایمان میں فرشتوں اوریوم آخرت (قیامت) کوبھی شامل کیاگیاہے۔

ایمان کے شرعی معنی

ایمان کالفظ ''امن'' سے مشتق ہے اس لیے امانت واعتماد کے معنی اس میں ہمیشہ ملحوظ رہتے ہیں اوران خبروں کی تصدیق کوایمان کہتے ہیں جوچشم دید نہ ہوں بلکہ عدم موجودگی کی ہوں اوران کی تصدیق صرف مخبر کی امانت ودیانت اوراس کے اعتماد ووثوق کی بناپر کی گئی ہو۔

لفظ ایمان لغت میں گومطلقاً تصدیق کے معنی میں آتا ہے لیکن اصطلاح شریعت میں اس کاعام استعمال صرف عالم غیب کی تصدیق میں آیاہے۔اورجب شریعت کی اصطلاح میں کوئی لفظ کسی خاص معنی کے لیے مخصوص ہوجائے تواب قرآن وحدیث میں اس کے لغوی یاعام معنی مرادلیناصحیح نہیں بلکہ جومعنی شرعی اصطلاح قرارپاچکے ہیں قرآن وحدیث میں وہی معنی مراد لیے جائیں گے۔

قرآن سے تائید

غائبات اورایمان کی اسی خصوصیت کوسورۃ بقرہ میں یؤمنون بالغیب کے لفظ سے ادافرمایاگیاہے،اس جگہ غیب کالفظ صرف بطوربیان واقع نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کوواضح کرنے کے لیے ہے کہ ایمان کاتعلق صرف غائبات کے ساتھ

ہے ، مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

لفظ غیب کے معنی

امام راغب لفظ غیب کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: والغیب فی قولہ تعالیٰ یؤمنون بالغیب مالایقع تحت الحواس ولا یقتضیہ بداھۃ العقل وانما یعلم بخبر الانبیاء علیھم السلام غیب کا لفظ مختلف معنوں میں مستعمل ہوتا ہے آیت یؤمنون بالغیب میں غیب کا اطلاق ان چیزوں پر کیا گیا ہے جو انسانی حواس کے ادراک سے بالاتر ہیں اور عقل بھی بدیہی طور پر ان کا تقاضہ نہیں کرتی ، وہ صرف انبیاء علیہم السلام کے بتانے سے معلوم ہوتی ہیں۔

عالم غیب کے غیر محسوس ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف ہمارے ضعیف حواس کی دسترس سے باہر ہوتا ہے نہ یہ کہ تحت الحواس آنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی فہم وفراست اور ان کی صداقت وامانت کے اعتماد پر عالم غیب پر ایمان لے آنا عین تقاضائے عقل ہے اور یہی تصدیق واذعان ایمان کی ساری قیمت ہے ، اگر غیب پر یہ اذعان واطمینان حاصل نہ ہو تو ایمان بے قیمت ہے۔

ایمان اور تصدیق میں فرق

لفظ تصدیق ہر خبر میں خواہ مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو یکساں طور پر مستعمل ہو سکتا ہے اور ایمان کے معنی بھی گو تصدیق کے ہیں مگر اس کا استعمال صرف ان خبروں تک محدود رہے گا جن کی تصدیق صرف مخبر کی امانت ودیانت اور اس کے اعتماد ووثوق کی بنا پر کی جاتی ہے ، اس لیے اگر ایک شخص طلوع آفتاب یا فوقیت آسمان

کی خبر دیتا ہے تو اس کے جواب میں ''امنت'' نہیں کہہ سکتے ، یا دو شخص اگر ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو لفظ ایک دوسرے کی تصدیق کے لیے صدق احدھا صاحبہ کہا جاتا ہے ، امن لہ نہیں کہا جا سکتا ، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں تصدیق کے لیے دوسرے پر اعتماد و وثوق کی کیا ضرورت ہے ، یہ خود اپنے مشاہدہ کی خبر ہے اس لیے یہاں ایمان کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہے ۔

ناواقف صاحبوں کی غلطی

ناواقف صاحبان ابھی تک یہ نہیں سمجھے کہ ایمان کا تعلق کس چیز سے ہے ، وہ چاہتے ہیں کہ دین کے جملہ غائبات کو پہلے اس طرح معقول بنا دیا جائے کہ پھر ان کی تصدیق کے لیے اعتماد رسول کا واسطہ ہی نہ رہے ، اور یہ نہیں جانتے کہ دلائل کی بحث سے گذر کر صرف رسول کے اعتماد پر اس کے اقوال و افعال تسلیم کر لینے کا نام ہی تو ایمان ہے ۔

ایمان کی روح

ایمان کی تمام روح صفت یقین ہے اور یقین اسی وقت قابل تعریف ہو سکتا ہے جبکہ عالم غیب پر ہو ، ورنہ اپنے مشاہدہ پر یقین کرنا بدیہی بات ہے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب یعنی دیکھنا تو یہ ہے کہ خدا اور رسول کے دین کی تائید بن دیکھے کون کون کرتا ہے ۔

ملائکہ ، انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان

خدا کے مقدس فرشتے عالم غیب کا مشاہدہ کرتے ہیں ان کا ایمان تو ایمان بالغیب ہی نہیں ، انبیاء علیہم السلام کا ایمان اگرچہ ایمان بالغیب ہے مگر ان کی متکفل

ومربی خود قدرت ہوتی ہے ،ان کا تعلق عالم غیب سے اگرچہ پس پردہ ہومگر پھر بھی براہ راست ہوتا ہے اور صحابہ کی آنکھوں کے سامنے اگرچہ بلاواسطہ عالم غیب نہ ہو مگر عالم غیب کا بلاواسطہ ترجمان یعنی رسول ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے ان کو دیکھ کر وہ عالم غیب کا یقین اپنے عینی مشاہدات سے بڑھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک سطحی شبہ کا ازالہ

رسول کی ذات گرامی قطعی طور پر عالم محوسات میں داخل ہوتی ہے اور اس کا عالم غیب میں شمار نہیں ہوتا بلکہ وہ دیکھنے والوں کے سامنے محوس ومشاہد موجود ہوتے ہیں اس لیے سطحی طور پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس صورت میں رسولوں پر ایمان لانا، ایمان بالمغیبات میں کیسے شمار کیا جائے گا، کیونکہ رسول کی ذات اگرچہ مشاہد ومحوس ہوتی ہے مگر اس کی رسالت ہر حال میں عالم غیب کا ایک آبدار گوہر ہوتا ہے اور اسی پر ایمان لانے کا انسان مکلف ہوتا ہے ،اس حیثیت سے رسول پر ایمان، ایمان بالمغیبات میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے دیکھنے والے بھی گویا بن دیکھے ہی رسول پر ایمان لائے ہوئے ہیں ،البتہ رسول پر ایمان لانے میں اس کے دیکھنے والوں کے لیے رسول کی شخصیت بلاشبہ بڑی حد تک معین ومددگار ہوتی ہے ،وہ اس کا مشاہدہ کر کے ایمان کے قبول کرنے میں اس سے براہ راست مدد حاصل کرتے ہیں۔

چونکہ رسول کی وفات کے بعد یہ مساعدت جو رسول کی ذات گرامی کے مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے باقی نہیں رہتی اور صرف عالم غیب کا حصہ یعنی اس کی رسالت باقی رہ جاتی ہے اس لیے اس پر ایمان لانا ہر حیثیت سے بن دیکھے ہو کر جزئی فضیلت کا موجب بن جاتا ہے ،اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے ''میری امت کی

مثال بارش کی سی ہے جس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا پہلا حصہ بہتر تھا یا پچھلا حصہ''۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اب رہے امت کے وہ لوگ جن کو نہ عالم غیب کا مشاہدہ حاصل ہوگا اور نہ ان کی آنکھوں کے سامنے رسول کی بصیرت افروز ہستی ہی ہوگی ، ایک خداتعالیٰ کی مقدس کتاب ہوگی اور اس کے رسول کے کچھ محفوظ اقوال و آثار ہوں گے وہ انہی کو دیکھ کر ایمان لے آئیں گے ، ان کا ایمان اگرچہ نامساعدت اسباب کی وجہ سے اس درجہ پر نہ ہو جس درجہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ہے لیکن یہ ایمان بھی قابل تعجب ضرور ہے ، فضیلت کلی گو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے لیکن ایک جہت سے فضیلت جزئیہ کے حق دار وہی رہیں گے اور اس پیرایہ سے رحمۃ للعالمین کی ساری کی ساری امت قابل غبطہ بن جائے گی ، کوئی حصہ کسی جہت سے کوئی حصہ کسی جہت سے۔

رسول و اوتار اور بروز

اسلام میں رسول نہ خداتعالیٰ کا اوتار ہوسکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہوسکتا ہے کہ ہیکل انسانی میں جلوہ نما ہو ، رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خداتعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے ، اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے ، بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق ، ناممکن اور محال ہیں۔

عقلی دلیل

عام حیوانات کو دیکھیے قدرت نے ان کو بھی ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور

صورتیں دی ہیں اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی، بلکہ ہر نوع اپنی انہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے اس عالم کا نظام قائم رہتا ہے، جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ ''کوئی انسان اپنے دائرہ سے ترقی کرکے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے'' کس قدر سفیہانہ اور غلط خیال ہے۔

انسانیت رسول کا کمال ہے

اس لیے رسول کے بارہ میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ رسول ایک انسان کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتب قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتا ہے، رسول خداتعالیٰ کا فرستادہ اور پیغمبر اور اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے، اس لیے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کیلئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے، جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غم زدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کرسکتا، جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا اور جو فطرت انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض اور چشم پوشی بھی نہیں کرسکتا۔

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کرسکتے اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں ان کیلئے مشکلات پیدا ہوجاتیں نسل انسانی پر یہ ایک بدنما داغ بھی ہوتا کہ اشرف المخلوقات انسان کا مصلح اور مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے، اس لیے خود رسول اور انسان کا شرف وکمال بھی یہی تھا کہ

رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا۔

یاد رکھیے کہ آنحضرت ﷺ کی عظمت یہ نہیں کہ آپ کی بشریت ہی سے انکار کر دیا جائے بلکہ آپ کی عظمت اس میں ہے کہ آپ کی بشریت کی وجہ سے جنس بشری کی افضلیت کا یقین پیدا کر لیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا عقیدہ

یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتداء میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتلایا گیا تھا، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰبنی آدم اما یأتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی فمن اتقی واصلح فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے سچے رسول آئیں جو تمہارے سامنے ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائیں تو جو تقویٰ کی راہ اختیار کرے اور نیک رہے تو ان پر نہ کوئی خوف و ہراس اور نہ کوئی غم۔

آیت بالا سے صاف واضح ہے کہ عالم کی ابتداء میں جن باتوں کی اولاد آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثت رسول، دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا، بلکہ قرآن کریم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کے انسان ہونے کو ایک مستقل انعام قرار دیا ہے ارشاد ہے لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یہاں امتنان واحسان کے موقع میں مجملہ اور باتوں کے تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے بعثت رسول، پھر اس انعام کیلئے سرزمین عرب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بنی اسماعیل میں ایک نبی کیلئے دعا فرمائی تو انہوں نے بھی اس

اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعا میں فرمایا ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم پھر جب اس دعاء مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعاء خلیل علیہ السلام میں لفظ منہم کی استجابت کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ من انفسہم سے ذکر کیا گیا یعنی رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جس سے انہیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے، انسانوں میں عرب، عربوں میں قریشی اور قریش میں ہاشمی بنایا مگر ان چند در چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا اس تمام سلسلہ میں جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آنحضرت ﷺ پر ختم ہوجاتا ہے کوئی بھی رسول ایسا نہیں تھا جو انسان نہ ہوتا۔

قرآنی مسئلہ

ثابت ہوا کہ انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کا مسئلہ صرف حدیثی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ قرآنی بھی ہے، قرآن کریم نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کے مسئلہ کو جابجا مسلمات اور بدیہیات کی طرح پیش کیا ہے۔

قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ

قاضی عیاض مالکی نے جو تعظیم رسول ﷺ میں بڑا بلند مذاق رکھتے ہیں اپنی تصنیف ''الشفاء'' میں مسئلہ عصمت پر بحث کرتے ہوئے آخر میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول یقیناً معصوم ہوتے ہیں مگر بشریت سے معصوم نہیں ہوتے، وہ بشر کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے جملہ ادوار طفلی، شباب اور شیخوخت سب سے عبور کرتے ہوئے آخر میں اسی طرح زیر زمین مدفون ہوجاتے ہیں جیسا کہ جنس بشر ہمیشہ سے مدفون ہوتی چلی آئی ہے۔

عقلی مسئلہ

جب تمام مخلوقات میں بشرہی سب سے افضل اور سب سے اشرف مخلوق ہے تو پھر انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی بشریت کا انکار کرکے آخر ان کو اور کس مخلوق میں شامل کیاجائے گا؟یہ توظاہر ہے کہ خالق کی جانب میں توکسی امر میں بھی شرکت کی گنجائش نہیں نہ اس کی ذات میں نہ اس کی صفات میں، پھر خالق سے ہٹ کر مخلوق کا ہی دائرہ ہے اس میں سب سے بڑھ کرافضل واشرف یہی نوع انسانی ہے ،اس کو رب العزت نے اپنی خلافت کے اعزاز کیلئے منتخب فرمایاہے، اگرانبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اس اشرف نوع سے خارج کردیے جائیں توپھر اور کونسی نوع میں ان کوداخل کیاجائے گا؟۔

بشریت کامطلب

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بشرضرور ہوتے ہیں مگراس کایہ مطلب سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ بالکل ایسے ہی بشرہوتے ہیں جیسے کہ عام بشرہواکرتے ہیں ،اس لیے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃوالسلام بشرہوتے ہوئے عام بشرسے اتنے ممتاز بھی ہوتے ہیں کہ اگر بیک وقت دونوں پرنظرڈالی جائے تویوں معلوم ہونے لگتاہے کہ گویاوہ علیحدہ علیحدہ دوصنفوں کے افرادہیں، متنبی شاعر نے ایک ہی صنف میں اشتراک کے باوجودان کے افرادمیں امتیازکی معقولیت کوکیاخوب اندازسے اداکیاہے۔

وان اتفق الانام وانت منهم
فان المسک بعض دم الغزال

اے ممدوح،اگرتومخلوق میں شامل ہوکرپھران سب پرفوقیت رکھتاہے تواس

میں تعجب کی بات کیا ہے، آخر مشک بھی تو اسی ہرن کے خون کا ایک حصہ ہوتا ہے، لیکن پھر ان دونوں میں کیا نسبت وہ متعفن اور یہ معطر، وہ ناپاک اور یہ پاک۔

پس اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی نفس بشریت میں تو سب انسانوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، لیکن پھر ان سے مشک کی طرح ممتاز بھی ہوتے ہیں، صرف اپنی سیرت میں ہی نہیں بلکہ اپنے جسم وجوارح میں بھی اور ان کے خواص میں بھی دوسرے انسانوں سے وہ ممتاز ہوتے ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ کا ارشاد

امام رازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام جس طرح عام بشر سے اپنی روحانی قوتوں میں ممتاز ہوتے ہیں اسی طرح جسمانی طاقتوں قوت سامعہ، باصرہ، شامہ، اور ذائقہ میں بھی ممتاز ہوتے ہیں (کبیر ج ۲ ص ۴۵۵)

عالم کے اندر قدرتی تفاوت وتفاضل

عالم میں قدرت نے مختلف انواع اور انواع میں مختلف اصناف پھر اصناف میں مختلف استعداد کے افراد پیدا فرمائے ہیں، دیکھیے نباتات، حیوانات اور انسان یہ مختلف انواع ہیں اور ہر عاقل جانتا ہے کہ ان انواع میں کتنا فرق ہے، جمادات بالکل بے حس وشعور نظر آتے ہیں، نباتات یہاں کچھ ان سے پیش گام ہیں اور حیوانات کچھ کچھ ادراک وعلم سے بھی فیض یاب معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ جب آخری نوع انسان کا نمبر آتا ہے تو اس کے شعور وحس، علم وادراک کے سامنے دوسری انواع ایک ذرہ بے مقدار نظر آتی ہیں، مگر کیا اس کی برتری کی وجہ سے دوسری انواع کے ساتھ اس کی مخلوقیت میں شرکت سے کوئی شخص انکار کر سکتا ہے؟ اسی طرح اگر

اصناف پر غور کیا جائے تو معمولی پتھر بھی ایک پتھر ہے اور لعل وجواہرات بھی پتھر ہی ہیں، گھاس بھی ایک نبات ہے اور گیہوں بھی، اسی طرح گدھا بھی ایک جانور ہے اور گھوڑا بھی مگر کیا اس اشتراک کی وجہ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ سب اصناف برابر ہیں ان میں باہم کوئی تفاضل نہیں۔

اسی طرح اب اگر ہر صنف کے افراد پر غور کیا جائے تو ہر صنف کے افراد میں بھی فضل وقیمت کا اتنا بڑا تفاوت نظر آئے گا کہ اس کا ضبط واحصاء مشکل ہے، لعل وجواہر کی قیمتوں کے تفاوت پر غور کیا جائے، اسی طرح حیوانات میں گھوڑے کی صنف کے افراد کی قیمتوں پر غور کیا جائے تو فضیلت کے اتنے درجات نظر آئیں گے کہ صنفی اشتراک کے بعد بھی ان میں گویا کوئی اشتراک ہی نہیں۔

نوع انسانی کے افراد میں تفاوت

اسی طرح نوع انسانی کا حال ہے بلکہ یہ نوع جتنی شریف تر ہے اس کے افراد میں تفاوت بھی اتنا ہی بے اندازہ ہے، کافر بھی انسان ہی کا فرد ہے اور مسلم بھی، پھر مقبولین کے افراد کو اگر مجملاً ضبط کیا جائے تو قرآن کریم کے الفاظ میں وہ چار طائفہ ہیں، انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین، ان کے درمیان فضائل وکمالات میں بے اندازہ تفاوت ہے، پھر یہی حال ان میں سے ہر طائفہ کا ہے، اسی لیے کسی صنف یا نوع کے افراد میں ان کے باہم تفاضل کا انکار کرنا نہ تو یہ حقیقت پر مبنی ہے اور نہ ہی ان کے تفاضل کا اقرار کرکے ان کے صنفی یا نوعی اشتراک کا انکار کرنا یہ علم کی بات ہے، اب جس فریق نے انبیاء علیہم السلام کے امتیازات اور فضائل کا باب پڑھ کر ان کے بشر ہونے کا ہی انکار کر ڈالا وہ بھی تاریکی میں ہے اور

جس نے ان کی بشریت کا اقرار کرکے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لاکھڑا کردیا وہ بھی مقام رسالت سے بڑا بے بہرہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا صحیح مقام

انبیاء علیہم السلام کا صحیح اور ٹھیک مقام یہ ہے کہ وہ بشر بلکہ سید البشر ہوتے ہیں، لیکن بشر ہونے کے باوجود وہ عام بشر سے نہ صرف یہ کہ روحانی کمالات ہی میں ممتاز ہوتے ہیں بلکہ جسمانی اوصاف اور کمالات میں بھی ان کو گوناگوں خصوصیات اور امتیازات حاصل ہوتے ہیں، اور عام انسانوں کے اجسام کی بنسبت انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں بھی بعض جسمانی خواص عطا فرما کر عام انسانوں سے ان کو ممتاز کیا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کے بعض خواص

قالب انسانی آپ کو بھی ملا مگر وہ قالب جو منور ہے، پسینہ آپ کو بھی آیا مگر وہ پسینہ نہیں جو عام انسانوں کو آتا ہے اور دماغ کو متعفن کردیتا ہے بلکہ وہ پسینہ جو مشام جان کو معطر کردے، سوتے آپ بھی تھے مگر وہ نیند نہیں جو دل کو غافل کردے بلکہ عین نیند کی حالت میں بھی آپ کا قلب مبارک دوسرے تمام بیداروں سے زیادہ بیدار رہتا تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ کا خواب وحی ہوتا ہے اور آپ کی نیند ناقض وضو نہیں ہوتی، دیکھتے آپ بھی تھے مگر عام انسانوں کی طرح صرف سامنے ہی کی چیزوں کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ بعض اوقات پشت کی جانب سے بھی اسی طرح دیکھتے تھے جیسا کہ اپنے سامنے کی جانب سے، وفات کے بعد آپ کا جسم مبارک بھی دفن کیا گیا مگر آپ کے پورے کے پورے جسم کی ساخت کچھ ایسی امتیازی ہے کہ وہ زمین کے تخریبی اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔

یوں تو ادویات کے ذریعہ سے اجسام کا بعد موت کے محفوظ رکھنا مصر کی عام صنعت تھی اور اسی صنعت کی بدولت آج عجائب گھروں میں ہزاروں سال کی لاشیں موجود نظر آتی ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی جماعت چونکہ صنعت اجتباء واصطفاء کے ماتحت ہوتی ہے اس لیے بغیر کسی صنعت اور کسب واکتساب کے ہی ان اجسام کی ابتدائی نہاد ہی میں اس حفاظت کا امتیاز رکھ دیا گیا ہے۔

اب سوچیے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے جسم عنصری ہی میں کوئی امتیاز اور خصوصیت نہیں ہوتی تو جس غذا کے اثرات سے دوسرے جسموں کو متعفن پسینہ آتا ہے وہ ان کو کیوں نہیں آتا؟ اور ان کے حواس کے ادراک کا دائرہ عام انسانوں سے بالاتر کیوں ہوتا ہے؟ اور کیوں ان کی نیند عام انسانوں کی سی نہیں ہوتی؟ عام انسانوں میں غفلت کی نیند صحت کی علامت ہو اور انبیاء علیہم السلام کے یہاں تیقظ کی نیند موجب کمال ہو، کیا اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے اجسام عنصریہ کی نہاد ہی کچھ عام اجسام سے نرالی ہوتی ہے۔

ان کمالات کے باوجود بھی وہ بشر ہی ہیں

مگر ان کمالات کے ہوتے ہوئے بھی انبیاء علیہم السلام کا قدم سرمو بشریت سے باہر گیا؟ ہرگز نہیں انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں خواہ کتنی ہی خصوصیات ہوں مگر وہ پھر بھی جسم کی خصوصیات ہوں گی جو ان کے عام اجسام سے بالاتر ہونے کی دلیل تو بن سکتی ہیں مگر جو ذات عالی جسم وجسمانیات سے بھی بالاتر ہے اور ان صفات وخصوصیات کی خالق ہے اور ان میں سے ہر صفت جس کے لیے نقص در نقص اور عیب در عیب ہے بھلا اس کے ساتھ کوئی ادنیٰ سا اشتراک کیسے پیدا کر سکتی ہیں؟ جو

لوگ آنحضرت ﷺ کی بشریت کے منکر ہیں در حقیقت نہ توان کو بشریت کے کمالات سے آگاہی ہے نہ ہی خدائی صفات کا اندازہ ہے، صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے کمالات بشریت کے اقرار سے خدائی توحید کو مکدر سمجھنا بھی غلطی ہے اور خدائی توحید کا کمال آپ کے کمالات بشریت کے انکار میں ہی سمجھنا بھی غلط ہے۔

جو لوگ انبیاء علیہم السلام کو خدائی عظمت دے کر ان کو خوش کرنا چاہتے ہیں وہ در حقیقت ان کی ناراضگی کو خرید رہے ہیں اور جو محروم القسمت انبیاء علیہم السلام کا ادب بھی نہیں جانتے وہ دراصل اپنے خدا کا غصہ مول لے رہے ہیں۔

محمد از تو می خواہم خدارا

خدایا از تو می خواہم محمد

رسولوں کا تعارف لفظ رسول سے

رسولوں کے صحیح مقام کے سمجھنے کے لیے خود لفظ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے، اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہوجاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لیے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر وایمان کے درمیان خط فاصل ہوسکتی ہیں، اسی لیے خدا تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظ ''رسول'' سے پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا وہ بھی ''رسول'' ہے، ارشاد ہے محمد رسول اللہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں ما محمد الا رسول محمد (ﷺ) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ نہیں رکھتے۔

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لیے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔

الغرض رسول کے لیے جو جامع سے جامع لفظ اختیار کیا تھا وہ خود لفظ رسول تھا اور اسی لیے اذانوں میں، خطبوں میں اور نماز میں جس لفظ کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے وہ یہی لفظ رسول ہے۔

وحدتِ ملی

رسول کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحدت ملی کا ایک مستحکم مرکز ہوتا ہے، اس لئے اس کی ذات ایمان و کفر کا محور ہوتی ہے یعنی اس سے وابستگی ایمان اور اس سے علیحدگی کفر کے نام سے موسوم ہوتی ہے، ہزاروں اختلافات رسول کی ذات سے وابستگی کے بعد وحدت و اخوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی جمعیتیں رسول کے دامن سے علیحدہ ہو کر صفت وحدت سے خالی ہو جاتی ہیں، اللہ تعالی فرماتے ہیں واذکروااذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا اور دوسری صورت کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تحسبہم جمیعا وقلوبہم شتی آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے قبل عرب کے اختلافات کا تصور کیجئے اور نقطۂ رسالت پر جمع ہونے کے بعد ان کی شان وحدت کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ ہزاروں افراد یا تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے یا فردِ واحد کی طرح ایسے ایک جان ہو چکے تھے کہ مشرقی مسلمان کی تکلیف سے مغربی مسلمان کو وہی تکلیف محسوس ہوتی تھی جو ایک انسان میں ایک عضو کی تکلیف سے تمام اعضاء کو محسوس ہوتی ہے، وہ ابھی یا تو اینٹوں کے ڈھیر کی طرح میدان میں

بکھرے پڑے ہوئے تھے یاایک ہی ساعت کے بعد ایک مستحکم تعمیر کی شکل میں منظم ومرتب تھے جس کی ہراینٹ دوسری اینٹ سے مرتبط اور باعث استحکام تھی ۔ جس طرح دیوار کی اینٹیں باہم بھی ایک دوسرے کیلئے باعث استحکام ہوتی ہیں اور چھت کا بوجھ بٹانے میں بھی برابر کی شریک رہتی ہیں مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ باہمی اور قومی بوجھ کو اسی طرح تقسیم کرلیا کریں ،اگروہ ایسا کرلیں تو ان کا منتشر شیرازہ دنیا کے سامنے ایک مضبوط دیوار کی طرح بن سکتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان وحدت واجتماع کی دعوت دیتا ہے اور کفر تحزب وتشتت کی ، اسی لئے قرآن کریم نے جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کفر کا نقشہ کھینچا تو اس کا جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں فرمایا وہ ان کی باہمی عداوت وتحزب تھا ، پھر اسلام کے بعد جس نعمت کا سب سے زیادہ احسان جتایا وہ ان کی باہمی وحدت اور محبت واخوت تھی ،ایسی وحدت واخوت کہ اگرچہ ان کے قالبوں کے مابین مشرق ومغرب کا فاصلہ بھی ہوتا مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے کی تکلیف کے احساس میں اتنے قریب ہوتے کہ مشرق کے ایک مسلمان کے پیر کے کانٹے کی چبھن مغرب کا رہنے والا مسلمان اپنے دل میں محسوس کرتا ،ان کا یہ رشتۂ محبت واخوت صرف مبالغہ اور محض ایک رنگ آمیزی نہیں بلکہ ان کے احساسات کی صحیح ترجمانی ہے ، ارشاد ہے واذکروااذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا یادکرو تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ تعالی نے تمہارے درمیان ایسی محبت پیدا کردی کہ محض اس کی مہربانی کی بدولت تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے ۔

یاد رکھئے کہ آپ کا ایمان جتنا کامل اور مستحکم ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی آپ کا اتحاد اور قومی تعمیر بھی مستحکم ہوتی چلی جائے گی اور جتنا اس میں نقصان پیدا ہوتا رہے گا اسی قدر آپ کے اتحاد اور قومی تعمیر میں بھی ضعف پیدا ہوتا رہے گا۔ تعجب یہ کہ وحدت و افتراق کے جو بنیادی اسباب ہیں کم از کم مسلمان ان سے کیونکر غافل ہیں، وہ جس مجمع میں اتحاد و اخوت کی دعوت دیتے ہیں اس میں اصل رشتۂ ایمانی پر ضرب بھی لگاتے جاتے ہیں۔

دنیا کی تمام وحدتیں ملی وحدت کے سامنے ہیچ ہیں

وحدت قومی، وحدت ملکی، وحدت قبیلہ، وحدت نسب اور اسکے سوا جتنی وحدتیں پیدا ہوسکتی ہیں وہ سب اسی حقیقی وحدت ملی کے سامنے ہیچ اور لاشے ہیں، جب کبھی اس وحدت حقیقیہ کی دوسری وحدتوں سے ٹکر ہوئی تو دوسری تمام وحدتیں پاش پاش ہوکر مٹ گئیں اور صرف یہی ملت کی ایک مرکزی وحدت باقی رہ گئی۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے بلکہ وہ منتخب شدہ ہوتے ہیں

جس طرح حکومت کا کوئی عہدہ اور منصب بڑی سے بڑی ڈگریاں حاصل کرکے بھی نہیں مل جاتا اور جب تک حکومت کسی شخص کا خود انتخاب کرکے اس کو کوئی عہدہ اور منصب عطا نہ کردے اس وقت تک وہ اس عہدہ و منصب پر فائز نہیں ہوسکتا اسی طرح رسالت بھی چونکہ ایک منصب اور عہدہ ہے اس لئے یہ بھی کسی شخص کی عبادت و ریاضت سے ہی حاصل نہیں ہوجاتا اور نہ کسب و اکتساب سے اس منصب پر فائز ہوا جاسکتا ہے، بلکہ یہ دست قدرت کا براہ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لئے خدا تعالیٰ انتخاب فرما کر منصب رسالت پر مامور فرما دیتے ہیں۔

جس قدر "رسول" دنیا میں آئے آپ سب کی سیرت کا تفصیلی مطالعہ کر جایئے، ان کی زندگی کا ورق ورق لوٹ جایئے مگر قرآن وحدیث سے کہیں ثابت نہ ہوگا کہ کسی شخص کو منصب رسالت اس کی ریاضت وعبادت کے صلہ میں عطا کیا گیا ہے بلکہ جس کسی کو بھی خداتعالیٰ نے یہ منصب عطا فرمایا ہے اس کو براہِ راست اس منصب سے نواز دیا ہے، اس لئے کہ یہ منصب براہ راست خداتعالیٰ کے اصطفاء اور اجتباء پر موقوف ہے، کسی کی ریاضت وعبادت اور کسب واکتساب سے یہ منصب حاصل نہیں ہوسکتا۔ الله يصطفي من الملائكة رسلا ومن الناس اللہ تعالیٰ فرشتوں میں اور انسانوں میں رسول اپنی ہی پسند سے بناتا ہے الله اعلم حيث يجعل رسالته یہ بات خدا ہی خوب جانتا ہے کہ اسے اپنا رسول کسے بنانا ہے۔

رسالت وہبی ہے کسبی نہیں ہے

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسالت صرف وہبی ہے کسبی نہیں ہے، یعنی عبادات وریاضات سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس میں چاہا نبوت ورسالت کی اہلیت رکھ دی۔ دوسری آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصب رسالت ونبوت جن خصوصیات کی بنا پر مرحمت ہوتا ہے ان کا علم بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہوتا اور ان کا انتخاب کوئی اور نہیں کر سکتا۔

غرضیکہ رسالت کا معاملہ رزق کی طرح صرف خدائی تقسیم پر موقوف ہے، اس لئے جب کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ کی رسالت میں اپنی رائے زنی شروع کی تو نہایت "تحمیق" کے لہجہ میں یہ کہہ کر ان کو خاموش کر دیا گیا اهم يقسمون رحمة

ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم یعنی نبوت ورسالت رزق کی طرح ربوبیت کا حق ہے، رزق کی تقسیم اس نے کسی کے حوالہ نہیں کی ا پنے ذمہ رکھی ہے تونبوت کی تقسیم کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے۔

یہ سخت غلط فہمی ہے کہ نبوت کوان کمالات میں سے سمجھ لیاجائے جوپہلی امتوں کو کسی عبادت وریاضت کے صلہ میں یاانعام کے طور پر تقسیم کئے گئے ہیں، یہ صرف تشریعی ضرورتوں کی تکمیل کاایک منصب ہے جس میں قدرت اس کی صلاحیت پیداکرتی ہے اس کواس منصب کیلئے منتخب کرلیتی ہے۔

اگر نبوت ان کمالات میں سے ہوتی جومجاہدات وریاضات، پاکبازی، حسن نیت وغیرہ عبادات کے صلہ میں انعامی طور پر ملتے ہیں تویقیناً اس کیلئے سب سے موافق زمانہ خود نبی کی موجودگی کا زمانہ ہوتا، کیونکہ جتنی عملی جدوجہد، اتباع شریعت کا جتناجذبہ خود نبی کے زمانہ میں ہوتاہے اس کے بعد نہیں ہوتا، مگر نبوت کی تاریخ اس کے برخلاف ہے یعنی جب خداتعالیٰ کی زمین شر وفساد، طغیانی وسرکشی، تجبر وتمرد سے بھر گئی ہے، صلاح وتقویٰ کا تخم فاسد ہوگیاہے، رشدوہدایت کے آثار محوہو گئے ہیں وہی وقت انبیاء علیہم السلام کی آمد کاسب سے زیادہ موزوں قرار پایاہے، کیااس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں ہے کہ نبوت وہ انعام نہیں ہے کہ ولایت وصدیقیت کی طرح امتوں میں تقسیم کی جائے بلکہ دنیا میں انتہائی دورضلالت میں خدا کی صفت ہدایت کااقتضاء ہے، اس میں کسب واکتساب اور ماحول کی مساعدت ونامساعدت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نبوت ان کمالات میں سے نہیں ہے جوریاضات

ومجاہدات کے صلہ میں بطور انعام کسی وقت بھی بخشا گیا ہو بلکہ یہ ایک الٰہی منصب ہے جس کا تعلق تشریعی ضرورت اور براہ راست خدا تعالیٰ کی صفت اجتباء و اصطفاء کے ساتھ ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس منصب کیلئے چن لیتا ہے۔

رسالت کا مفہوم

آنحضرت ﷺ کی رسالت کا صحیح اور پورا مفہوم اسی وقت ادا ہوتا ہے جبکہ آپ کو خاتم النبیین بھی سمجھا جائے، آپ کو صرف رسول اللہ سمجھنا اور خاتم النبیین نہ سمجھنا آپ کی حیثیت کے صرف ایک ہی جزء کو ادا کرتا ہے اور وہ بھی مشترک جزء کو، آپ کے منصب عالی کا امتاز جزء خاتم النبیین ہے، لیکن چونکہ یہ دونوں حیثیتیں آپ کی ذات میں جمع ہیں اور اس طرح جمع ہیں گویا ایک ذات کے دو عنوان ہیں اس لئے عام طور پر صرف اقرار رسالت ختم نبوت کے اقرار کیلئے کافی سمجھا گیا جیسا کہ کلمہ توحید کا اقرار، اس کا اقرار گو رسالت کے اقرار سے ایک جداگانہ شے ہے مگر جو توحید آپ کی حکم برداری میں تسلیم کی جائے وہ اقرار بالرسالۃ کے ہم معنیٰ ہے اس لئے بعض احادیث میں صرف کلمہ توحید کی شہادت کو مدار نجات قرار دے دیا گیا ہے، اسی طرح آپ کی رسالت اور ختم نبوت کا مسئلہ سمجھنا چاہئے۔

عقیدہ ختم نبوت ایمان کا جزء ہے

حدیث میں جس طرح خدا تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح آنحضرت ﷺ نے اپنی ختم نبوت پر بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر ایمان آپ کی ختم نبوت پر ایمان لائے بغیر حاصل ہی نہیں ہوسکتا، قرآن کریم میں ولٰکن رسول اللہ کے ساتھ خاتم

النبیین کا لفظ اسی لئے ہے کہ آپ صرف رسول اللہ نہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں، اس کے برخلاف آپ سے پیشتر جتنے رسول ہوئے وہ صرف رسول اللہ تھے اسی لئے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیین ہے، یہ آنحضرت ﷺ کا مخصوص لقب ہے اور آپ ﷺ نے ہی اس کا دعویٰ کیا ہے، حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ لقب صرف بطور مدح نہیں ہے بلکہ یہ بہ حیثیت عقیدہ کے ایک عقیدہ ہے، خاتم الشعراء اور خاتم المحدثین کی طرح یہ صرف ایک محاورہ نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا تصور

آنحضرت ﷺ کے تصور کیلئے دو باتوں کا تصور ضروری ہے، یہ کہ آپ رسول اللہ ہیں اور یہ کہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں، آپ کے متعلق صرف رسول اللہ کا تصور آپ کی ذات گرامی کا ادھورا اور نا تمام تصور ہے بلکہ ان ہر دو تصورات پر آپ کا امتیازی تصور خاتم النبیین ہی ہے۔

ضروری تنبیہ

جب کسی لفظ کا ایک مفہوم اور اس کی مراد امت مسلمہ کے بتواتر استعمال کرنے اور اجماع سے متعین ہوگئی ہو تو قرآن وحدیث میں اس لفظ کے وہی معنیٰ مراد لئے جائیں گے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لغت کی استعانت یا دیگر شواہد سے اس لفظ کے دوسرے معنیٰ اور مفہوم مراد لے، مثلاً وحی کا لفظ ہے، لغت میں وہ کس معنیٰ کیلئے ہے اب اس پر بحث کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم میں جب اس لفظ کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے دائرہ میں ہوا ہے تو اس کے معنیٰ بندہ اور حق تعالیٰ کے مابین ہمکلامی کے ہوتے ہیں، اس لئے جب کہیں وحی کا لفظ انبیاء

ورسل علیہم السلام کے بارہ میں استعمال کیا جائے گا تو اس کے یہی معنی مراد لئے جائیں گے، یا مثلاً نبی کا لفظ ہے، یہ ''نبأ'' سے مشتق ہے اور لغت میں ''انباء'' کو ہر خبر کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا عام استعمال اب صرف غیب کی خبروں میں ہوتا ہے، تو نبی اللہ کے معنی (فعیل یعنی مفعول کا لحاظ کرتے ہوئے) یہ ہوں گے الذی نباہ اللہ یعنی جس کو اللہ نے نبی بنایا ہو اور اس کو غیب کی خبریں دی ہوں، اس کے بعد اب ختم نبوت کے مفہوم اور معنی پر غور کیجئے۔

ختم نبوت کے معنی

ختم نبوت کا لفظ ہمیشہ سے امت مسلمہ میں تواتر کے ساتھ استعمال ہوتا چلا آرہا ہے اور ہمیشہ سے اس لفظ کا مفہوم صرف یہی سمجھا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اب کسی جدید نبوت کا کوئی امکان نہیں ہے خواہ وہ کسی قسم اور کسی مرتبہ ہی کی کیوں نہ ہو، ظلی ہو یا بروزی، تشریعی ہو یا غیر تشریعی ہر قسم کی نبوت ختم کردی گئی مگر اس معنی سے نہیں کہ آئندہ نفوس انسانیہ کو کمال و تکمیل سے محروم کردیا گیا ہے بلکہ اس معنی سے کہ اب یہ منصب ہی ختم کردیا گیا ہے۔

صرف لفظ کا استعمال کافی نہیں

اگر کوئی جماعت صرف ختم نبوت کا لفظ تو استعمال کرتی ہے مگر ان معنوں سے نہیں جن میں کہ عام مسلمان اس کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں تو محض اس لفظ کے استعمال کرلینے سے اس کو عام مسلمانوں کی جماعت میں کیسے شمار کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ صرف جنت، دوزخ، نبوت اور معجزات کے الفاظ استعمال کرنے والے فلاسفہ کو صرف ان الفاظ کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کے عقائد سے متفق نہیں سمجھا

جاسکتا ہے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہوجائے کہ وہ ان الفاظ کا استعمال ان ہی معنوں میں کرتے ہیں جن میں کہ تمام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں، کیا نصاریٰ اور ہنود بھی توحید کا اقرار نہیں کرتے ؟مگر کیا صرف لفظ توحید کے استعمال کر لینے سے ان کو اسلامی توحید کا معتقد کہا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان واسلام کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان حقائق کو اپنے انہی معنوں میں مانا جائے جن میں کہ وہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں مسلم رہے ہیں، صرف رسمی الفاظ کی نقالی بے سود ہے۔

ختم نبوت کی عقلی وجہ

سنت اللہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو ختم فرمانے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو کامل کرکے ختم فرماتے ہیں، ناقص کو ختم نہیں فرماتے، نبوت بھی اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی اس لئے مقدر یوں ہوا کہ اس کو بھی ختم کردیا جائے، اگر آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت ختم نہ ہوبلکہ جاری رہے تو لازم آئے گا کہ ان کا خاتمہ نقصان پر ہو، ظاہر ہے کہ ایک نہ ایک دن عالم کا فنا ہونا ضروری ہے، اس سے قبل کسی نہ کسی نبی کا آخری نبی ہونا بھی عقلاً لازم ہے، اب اگر وہ آپ سے زیادہ کامل ہو تو اس کیلئے اسلامی عقیدہ میں گنجائش نہیں، اور اگر ناقص ہو تو خاتمہ نقصان پر تسلیم کرنا لازم ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب فطرت عالم پر غور کیا جائے گا تو جزء وکل میں ایک حرکت نظر آئے گی، ہر حرکت ایک ارتقاء اور کمال کی متلاشی ہوتی ہے، پھر ایک حد پر پہنچ کر یہ حرکت ختم ہوجاتی ہے، اور جہاں ختم ہوتی ہے وہی اس کا نقطۂ کمال کہلاتا ہے، انسان کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو وہ بھی نطفہ سے متحرک ہوکر دم وعلقہ

ومضغہ کے قالب طے کرتا ہوا خلق آخر پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور اسی کو اس کی استعداد فطری کا کمال کہا جاتا ہے، پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء میں پھر ایک حرکت اور ایک نشو و نما نظر آتا ہے اور وہ دور شباب پر مکمل ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی کو اس کا زمانہ کمال کہا جاتا ہے۔

نباتات اور اشجار کو دیکھئے تو وہ بھی ایک چھوٹی سی گٹھلی سے حرکت کرتے کرتے ایک تناور درخت بن جاتا ہے، آخر کار اس پر پھل نمودار ہوتے ہیں اور جب وہ نمودار ہوتے ہیں تو یہ اس کا کمال سمجھا جاتا ہے، اسی کمال پر پہنچ کر درخت کا ایک دور حیات ختم ہو جاتا ہے، آئندہ دور حیات کیلئے پھر اس کو بہت سے انہیں ادوار کو دوہرانا پڑتا ہے جن میں سے گذر کر وہ اس منزل تک پہنچا تھا یعنی موسم خزاں آتا ہے اور اس کے دور حیات کو ختم کر جاتا ہے، اگر قدرت کو اس کی پھر نشاۃ ثانیہ منظور نہ ہوتی تو وہ یونہی سوکھ کر ختم ہو گیا ہوتا مگر چونکہ اس کو ابھی باقی رکھنا منظور ہوتا ہے اس لئے پھر اسے وہی سبز سبز پتیاں، وہی ہری ہری لچکدار ڈالیاں مل جاتی ہیں، پھر اس پر پھول آتے ہیں اور آخر میں پھل نمودار ہوتے ہیں، جب تک یہ درخت موجود رہتا ہے اسی طرح اپنے ارتقائی مدارج کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوہرایا کرتا ہے، جو درخت اپنی ابتدائی کڑیوں کو پھر نہیں دوہراتے وہ ایک مرتبہ پھل دے کر اپنی زندگی ختم کر جاتے ہیں جیسے کیلا کا درخت ہے۔

اسی طرح سمجھا جانے کہ عالم نبوت میں بھی ایک تدریج نمایاں ہے، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر تمام شریعتوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں، ہر پچھلی شریعت پہلی سے نسبتاً ارتقائی شکل

میں نظر آتی ہے، اس لئے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جاکر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جائے۔

لیکن جب خود نبوت ہمارے ادراک سے بالاتر حقیقت ہے تو اس کے آخری نقطۂ کمال کا ادراک بدرجہ اوّل ہماری پرواز سے باہر ہونا چاہئے اس لئے ضروری ہے کہ قدرت خود اس کی کفالت فرمائے اور خود ہی اس کا اعلان کر دے کہ نبوت کا ارتقاء یہاں ختم ہوا ہے، وہ مرکزی اور کامل ہستی آنحضرت ﷺ کی مبارک ہستی ہے، قرآن کریم میں اس کا اعلان فرماتے ہوئے ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین کے بعد فرمایا ہے و کان اللہ بکل شیء علیما یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو ہر چیز کا علم ہے وہی یہ جانتا ہے کہ نبیوں میں خاتم النبیین اور آخری نبی کون ہے، یہ بات تمہاری دریافت سے باہر ہے کہ تم معلوم کر سکو کہ اس کے رسولوں کی مجموعی تعداد کتنی ہے، ان میں اوّل کون ہے اور آخری کون ہے۔

نبوت نے اپنا مقصد پالیا

آنحضرت ﷺ کے بعد اب کوئی نیا رسول نہیں آئے گا کیونکہ اگر کوئی رسول آئے تو یا تو وہ آپ سے افضل ہوگا یا مفضول، اگر افضل ہو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت نے ابھی تک اپنے اس کمال کو نہیں پایا جس کیلئے وہ متحرک ہوئی تھی اور اگر مفضول ہو تو کمال کے بعد پھر یہ نزولی حرکت اسی وقت مناسب ہو سکتی ہے جبکہ عالم کی پھر نشاۃ ثانیہ تسلیم کی جائے۔

لیکن چونکہ دنیا کی اجل مقدر پوری ہو چکی تھی اس لئے ضروری تھا کہ نبوت کی آخری اینٹ بھی لگا دی جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ دنیا کی عمر کے ساتھ قصر نبوت کی

بھی تکمیل ہوگئی ہے اور نبوت نے اپنا مقصد پالیا ہے۔

ختم نبوت دینی ارتقاء اور خداتعالیٰ کے انتہائی انعام کا اقتضاء ہے اور وہ کمال ہے کہ اس سے بڑھ کر امت کیلئے کوئی اور کمال نہیں ہوسکتا ہے، پھر حیرت ہے کہ اتنے عظیم الشان کمال کو برعکس محرومی سے کیسے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

دین اسلام کامل ہوچکا ہے اس کی روشنی اقصاء عالم میں پھیل چکی ہے، خدائی نعمت پوری ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی اور ہمیشہ کیلئے ایک اسلام ہی پسندیدہ دین ٹھہر چکا ہے اس لئے آئندہ نہ گمراہی اتنا تسلط حاصل کرسکتی ہے کہ ہدایت کو فنا کردے اور اس کے تمام چشمے خشک ہوجائیں، اس کی ایک کرن بھی چمکتی نہ رہے اور نہ اس لئے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی ہے۔

ختم نبوت درحقیقت اس کا اعلان ہے کہ نور نبوت اب تمام عالم کو اس طرح روشن کرچکا ہے کہ اب کفر خواہ کتنا ہی سر پٹکے مگر وہ اس کے بجھانے سے بجھ نہیں سکتا، خدا کا اقرار اور اس کے صفات کی معرفت، غیب کا یقین اب مجموعہ عالم کا اس طرح جزو بن چکے ہیں اگر کہیں اس مرتبہ پھر یہ معرفت ختم ہوگئی تو بس اس کے ساتھ ہی عالم کی روح بھی نکل جائے گی اور قیامت قائم ہوجائے گی۔

بڑی غلط فہمی

یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ ختم نبوت کو کمالات کے ختم کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، ہمارے اس بیان سے روشن ہوگیا کہ نبوت کا ختم ہونا تو خدائی نعمت کے اتمام اور دین کے انتہائی ارتقاء وعروج کی دلیل ہے، البتہ کمالات وبرکات کا خاتمہ بلاشبہ محرومی ہوتی مگر روایات سے ثابت ہے کہ امت مرحومہ کے کمالات تمام امتوں سے

زیادہ ہیں اور اتنے زیادہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کو بھی اس امت کے کمالات سن کر تمنا ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اس امت کے ایک فرد ہوتے۔

ایک مغالطہ

ایک مغالطہ یہ ہے کہ ختم نبوت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نبوت کی بندش گویا آپ ﷺ کی تشریف آوری کی وجہ سے ہوئی ہے، اگر آپ تشریف نہ لاتے تو شاید کچھ اور افراد کو نبوت مل جاتی، یہ بھی انتہائی جہالت ہے، خاتم النبیین کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سلسلۂ انبیاء علیہم السلام میں آپ ﷺ سب سے آخری نبی ہیں، اس لئے آپ کی آمد ہی اس وقت ہوئی ہے جبکہ انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک فرد آچکا تھا، اس لئے آپ کی آمد نے نبوت کو بند نہیں کیا بلکہ جب نبوت ختم ہو گئی تو اس کی دلیل بن کر آپ ﷺ تشریف لائے ہیں اور اس معنیٰ سے آپ کو خاتم النبیین کہا گیا ہے، اگر علم ازلی میں کچھ اور افراد کیلئے نبوت مقدر ہوتی تو یقیناً آپ کی آمد کا زمانہ بھی ابھی اور موخر ہو جاتا۔

فاحش غلطی

سب سے زیادہ فاحش غلطی یہ ہے کہ اس پر غور نہیں کیا گیا کہ پہلے ایک نبی کے بعد دوسرا نبی کیوں آتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نبوتیں خاص قوم اور خاص زمانہ کیلئے ہوتی تھیں اس لئے ہر نبی کے بعد لامحالہ دوسرے نبی کی ضرورت باقی رہتی تھی، لیکن جب وہ نبی آگیا جس کی نبوت کسی خطہ، کسی قوم اور کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں تو اب اس کے بعد نبوت کا سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کی موجودگی کے زمانہ میں۔

آپ کا دورۂ نبوت دوسرے انبیاء کی طرح ختم نہیں ہوا، پس درحقیقت نبوت تو اب بھی باقی ہے اور وہ نبوت باقی ہے جو تمام نبوتوں سے کامل تر ہے ہاں نبی اور کوئی باقی نہیں رہا، جب آپ کی نبوت باقی ہے تو اب جدید نبوت کا سوال خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست　　　　خم وخمخانہ بامہر ونشاں ست

آپ ﷺ کا تشریف لانا تمام جہان کیلئے رحمت ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب خاتم بذات خود تمام جہاں کیلئے رحمت بن کر آ گیا ہے، اتنی بڑی رحمت کہ اس کے بعد کسی اور رحمت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

آج تک ہر رسول کے بعد دوسرے رسول کے انکار سے کفر کا خطرہ لگا رہتا تھا خاتم النبیین کی آمد سے یہ کتنی بڑی رحمت ہوئی کہ اس راستہ سے اب کفر کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا، نہ کسی اور رسول کے آنے کا امکان ہے نہ کسی کے انکار سے کفر کا اندیشہ باقی ہے۔

بعثت عام اور ختم نبوت

اگر آپ ﷺ کی بعثت عام نہ ہوتی اور نبوت ختم ہوجاتی تو آنے والی امت بغیر رسول کے رہ جاتی، یہ بجائے رحمت کے ایک اور زحمت ہوتی اس لئے جب نبوت کا ختم ہونا مقدر ہوا تو آپ ﷺ کی بعثت کا دامن قیامت تک کے انسانوں پر پھیلا دیا گیا تاکہ رہتی دنیا تک تمام انسان کامل واکمل رسالت کے نیچے آجائیں اور کسی دوسرے رسول کے محتاج نہ رہیں۔ اور اگر آپ کی بعثت تو عام ہوتی مگر نبوت ختم

نہ ہوتی تواب آئندہ اگر کوئی اور کامل رسول آتا اور آپ کی بجائے اس کی اتباع لازم ہوتی تو آپ کا ناقص ہونا ثابت ہوتا (العیاذ باللہ) اور اگر کوئی ناقص رسول آتا تو قابل کے ہوتے ہوئے ناقص کے دامن میں آنا بجائے رحمت کے زحمت بن جاتا اس لئے بعثت عامہ کے بعد نبوت کا ختم ہونا ضروری اور لازمی ہوگیا۔

ظلی بروزی نبوت کی کوئی قسم نہیں ہے

تاریخ نبوت پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اس میں صرف دو ہی قسم کی نبوتیں ملتی ہیں، ایک تشریعی دوسری غیر تشریعی اور یہ دونوں براہِ راست نبوتیں ہیں، تو اب نبوت کی ایک اور تیسری قسم (ظلی، بروزی اور بالواسطہ نبوت) کا تراشنا تاریخ نبوت کے خلاف ہے۔

قرآن وحدیث میں کوئی ایک آیت اور ایک حدیث بھی دستیاب نہیں ہوسکتی جس میں آنے والی امت میں سے کسی کو نبی کہا گیا ہو اور نہ ہی دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا نبی بتلایا جاسکتا ہے جو کسی نبی کے واسطہ اور اس کی اتباع کے صلہ میں انعامی طور پر نبی بنادیا گیا ہو۔

احادیث میں آنحضرت ﷺ کے بعد ہر قسم کی نبوت کی نفی کردی گئی ہے اور کسی تفصیل کے بغیر لانبی بعدی میرے بعد کوئی نبی نہیں کہہ دیا گیا ہے اسی لئے آپ کے بعد ہر مدعی نبوت کو کذاب ودجال کہا جارہا ہے، کسی حدیث سے ظلی، بروزی نبوت کی تقسیم ثابت نہیں ہوتی۔

پھر آخر کس دلیل سے نبوت کی ایک تیسری قسم مان کر اس کو جاری قرار دیا جائے؟ کیا آیت خاتم النبیین کے عموم میں محض اختراعی تقسیم کی وجہ سے تخصیص

پیدا کر کے قرآن کریم میں کھلی تحریف کا ارتکاب کر لیا جائے؟

فنافی الرسول اور اتباع کی وجہ سے بھی نبوت نہیں مل سکتی

اگر فنافی الرسول اور اتباعِ رسول کی وجہ سے کسی کو نبوت مل سکتی اور امت میں کوئی ہلکی سے ہلکی نبوت بھی جاری ہوتی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ضرور اس سے حصہ دیا جاتا مگر حالت یہ ہے کہ شب ہجرت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بستر پر ساری رات آپ ﷺ کی جگہ قربان ہونے کے شوق میں پڑے ہوئے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ راستہ کے ہر خطرناک موقع پر سر بکف حاضر ہیں مگر فنافی الرسول کے سمندر کے ان شناوروں کو نبوت کا چھوٹا سا چھوٹا موتی بھی ہاتھ نہیں آیا، بلکہ اگر کسی کے متعلق سیاق کلام میں نبوت کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی پیدا ہوتا نظر آیا تو اس کو بڑی صفائی سے دور کر دیا گیا اور کسی کیلئے لفظ نبی کی گنجائش نہیں دی گئی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے غزوۂ تبوک جاتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ میں اپنا جانشین بنایا اور اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسٰی میں اس علاقہ اور نسبت کا تذکرہ آیا جو صرف حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے درمیان تھا تو الا انہ لا نبوۃ بعدی (رواہ مسلم) فرما کر اس غلط فہمی میں پڑنے سے امت کو بچا لیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت و جانشینی بھی کہیں حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح خلافت نبوت نہ ہو۔

تنبیہ: ایسی حدیثوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ہارون علیہ السلام کی ذات گرامی سے تشبیہ دینا مقصود نہیں ہے اسی لئے انت بمنزلۃ ھارون نہیں

فرمایا بلکہ اس نسبت اور علاقہ سے تشبیہ مقصود ہے جو حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے درمیان تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی غیبت کے زمانہ میں کوہ طور جاتے ہوئے اپنی قوم کی نگرانی کیلئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کا انتخاب کیا تھا اسی طرح اپنی غیبت میں تبوک جاتے ہوئے میں تمہارا انتخاب کرتا ہوں اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ نبی تھے تم نبی نہیں ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبوت ملتی تو وہ یقیناً آپ ﷺ کے اتباع ہی کی بدولت ملتی اور وہ ظلی، بروزی نبوت کہلاتی مگر جب اس احتمال کی بھی نفی کر دی گئی تو اب اتباع رسول سے نبوت کے ملنے اور ظلی، بروزی، مجازی، کسی طرح کی نبوت کا بھی احتمال باقی نہیں رہا۔

محدّث اور مکلّم بھی نبی نہیں ہوتے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ سے نسبت اخوت تھی اس کے باوجود نبی نہیں بن سکے، اس نسبت اخوت سے بڑھ کر ابنیت کی نسبت ہے گمان ہو سکتا تھا کہ آپ کا کوئی فرزند ہوتا تو شاید وہ نبی ہو جاتا چنانچہ ان کے متعلق حدیث میں یہ ارشاد ملتا ہے: لوعاش ابراھیم لکان صدّیقا نبیًا اگر ابراہیم زندہ رہتے تو صدیق نبی ہوتے لیکن جس ذات قدیر و حکیم نے ختم نبوت کو مقدر فرمایا تھا اس نے ان کے لئے عالم تقدیر میں اتنی عمر ہی نہیں لکھی کہ ان کی علو استعداد ظاہر ہو سکے اور ختم نبوت سے ٹکرائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فطرت میں رسول خدا ﷺ کے دامن اقدس سے وابستہ ہو جانے کے بعد کمالات نبوت کا کیسا انعکاس ہوا تھا اور آپ ﷺ

کی فطرت کو نبوت سے کتنی مناسبت تھی وہ خود آنحضرت ﷺ کے بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سایہ سے شیطان ترساں ولرزاں رہنے لگے تھے اور جس راستہ سے عمر رضی اللہ عنہ نکل جائیں تو شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیا کرتے تھے، وہ بولتے تھے تو بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وحی الٰہی ان کی موافقت میں بولتی تھی، وہ ملہم من اللہ اور محدث امت تھے مگر ان سب اوصاف وکمالات کے باوجود بھی ان کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے لو کان نبی من بعدی لکان عمر اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمر ہوتا، اس سے یہ بات اور زیادہ صاف ہوجاتی ہے کہ محدث اور مکلم بھی نبی نہیں ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا محدث ہونا اور نبی نہ ہونا دونوں باتیں حدیث سے ثابت ہیں، نتیجہ واضح ہے کہ محدث نبی نہیں ہوتا، حدیث میں بھی من غیر ان یکونوا انبیاء مگر وہ نبی نہ ہوتے تھے کہہ کر محدث کے نبی نہ ہونے کی تصریح کردی گئی ہے۔

اب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر نبی کہلاتے تو ظاہر ہے کہ مجازی طور پر ہی کہلاتے مگر جب وہ بھی نبی نہیں کہلاتے تو پھر امت میں کسی دوسرے کو نبی کہلانے کا استحقاق اور جواز کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

اگر مبشرات نبوت کا جزء ہیں تو کیا ان کو نبوت کہا جا سکتا ہے؟

احادیث میں ایک طرف تو رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں جزء کہا گیا ہے دوسری طرف بعض بلند اخلاق کو چھبیسواں جزء قرار دیا گیا ہے، حدیث میں ہے:

التؤدۃ والاقتصاد وحسن السمت من ستۃ وعشرین جزء من النبوۃ بردباری ومتانت، میانہ روی اور اچھی روش نبوت کا چھبیسواں جزء

ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان اخلاق کی وجہ سے کسی کو نبی نہیں کہا جاسکتا، جب چھبیسویں جزء کو نبوت نہیں کہا جاتا تو چھیالیسویں جزء کو نبوت کیسے کہا جاسکتا ہے۔

اسکے علاوہ یہ کہ جزء ہمیشہ اپنے کل کے مغائر ہوتا ہے دیکھئے یہی کلمات جن کا مجموعہ اذان کہلاتا ہے علیحدہ علیحدہ اذان نہیں کہلاتے، عناصر اربعہ انسان کے اجزاء ہیں مگر ان میں سے کسی کو انسان نہیں کہا جاتا، مثلاً پانی انسان کا ۴/ر حصہ ہے مگر انسان نہیں ہے، تو رؤیا صالحہ نبوت کا چھیالیسواں جزء ہو کر نبوت کیسے ہوسکتا ہے؟

افادہ: رؤیا صالحہ نبوت کے حقیقۃً اجزاء نہیں ہیں کیونکہ نبوت کسی ایسی حقیقت مرکبہ کا نام نہیں ہے جس کا تجزیہ و تحلیل ممکن ہو، وہ ایک منصب ہے جس کا تعلق صرف خدائی اصطفاء اور اجتباء پر موقوف ہے، ہاں اس کے کچھ خصائص ولوازم ہیں جو اس کی ماہیت کا جزء نہیں ہوتے کیونکہ اصطلاح میں خصائص واجزاء میں فرق ہوتا ہے، مگر اہل عرف کے نزدیک ان خصائص وفضائل ہی کو مجازاً اجزاء کہہ دیا جاتا ہے۔

ختم نبوۃ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت کمالات سے محروم ہوگئی

احادیث سے واضح ہے کہ اچھے خواب دیکھنا، الہام اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ، امت کا دینی اور دنیوی نظم ونسق قائم رکھنا یہ سب وظائف امت محمدیہ کے محدثین اور خلفاء کی طرف منتقل کردیے گئے ہیں، اگر کہیں نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو یہ اپنے کمالات واستعداد کے لحاظ سے اس کے اہل تھے کہ انہیں منصب نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا، اس سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ میں بھی استعداد نبوت تو موجود ہے اور انسانی بلند سے بلند کمالات اسے حاصل ہوسکتے ہیں اس لئے ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئے کہ امت کمالات سے محروم ہوگئی ہے بلکہ تمام تر

کمالات اور پوری استعداد ولیاقت کے باوصف اب چونکہ عہدۂ نبوت پر تقرری کے لیے کوئی جگہ خالی نہیں رہی اور منصبِ نبوت کا عطا ہونا بند ہوگیا اس لئے اس منصب پر کسی کا تقرر نہیں ہوسکتا۔

ظاہر ہے کہ کسی منصب پر تقرر کیلئے ذاتی استعداداور قابلیت کے علاوہ تقرر کی جگہ کا خالی ہونا بھی شرط ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں نبی نہیں ہوئے اگر اس کی وجہ یہ ہوتی کہ ان حضرات میں اتنی لیاقت واستعداد بھی نہ تھی تو یقیناً یہ اس امت کا نقص شمار ہوتا لیکن اگر تقرر کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے تو اس میں امت محمدیہ کا کوئی قصور نہیں نکلتا ہے، یہ بات حکومت کے نظم ونسق کے متعلق ہے کہ وہ کسی عہدہ پر کتنے اشخاص کا تقرر کرنا چاہتی ہے۔

امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے کمالات اور عظمت

اس سے امتِ محمدیہ کے کمالات اور عظمت کا اندازہ کرنا چاہئے کہ جن خدمات کے لئے پہلے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے اب اس امت کے علماء اور خلفاء اس کو انجام دیا کریں گے۔

اب غور کیا جائے کہ امت محمدیہ کی ہتکِ عزت اس میں ہے کہ اسے نااہل قرار دے کر اس میں نبی پیدا کیا جائے یا اس میں کہ اس کے خلفاء وہ خدمات انجام دیں جو پہلے کبھی انبیاء علیہم السلام ادا فرمایا کرتے تھے۔

اسلام میں ختم نبوت کے عقیدہ کو بنیادی عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے اسلئے آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی کس کس طرح حفاظت کی جارہی ہے، اگر کہیں ذرا بھی اس بنیادی عقیدہ کو ٹھیس لگتی نظر آتی ہے تو فوراً صفائی کے ساتھ اس کی اصلاح

کردی جاتی ہے اور معمولی سے ابہام کو بھی اس سلسلہ میں برداشت نہیں کیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیثیت

اسلام میں رسول کی حیثیت کے متعلق ایک اصولی اور سب سے مقدس عقیدہ یہ ہے کہ اس کی ذات بابرکات امت کیلئے مرضیات الٰہیہ کا نمونہ اور اسوۂ حسنہ بناکر بھیجی جاتی ہے، اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ خالق جل وعلا کی نظر میں جتنی پسندیدہ صفات ہیں وہ سب کی سب اس کی ذات گرامی میں جمع کردی جاتی ہیں اور جتنی صفات ناپسندیدہ ہیں وہ ایک ایک کرکے اس کی ذات عالیہ سے علیحدہ کردی جاتی ہیں کیونکہ کسی چیز کے نمونہ کہنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار ہے۔

حق تعالیٰ نے جہاں اپنی جانب سے اپنی کتاب قرآن کریم دے کر سرفراز فرمایا تھا اس کے ساتھ ہی اس کتاب کا ایک عملی نمونہ بھی عنایت فرمایا تھا اور وہ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے، لہٰذا جس طرح اللہ کی کتاب ہر قسم کے عیب ونقص سے منزہ ہے اسی طرح اس کا نمونہ بھی ہر عیب ونقص سے مبرا اور پاک وصاف ہونا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسوۂ رسول اللہ کو بھی اپنا پیشوا بنالیا، اللہ تعالیٰ نے رسول کی ذات گرامی کو اسوۂ حسنہ فرمایا اور صحابہ کرام نے کسی لیت ولعل کے بغیر آپ ﷺ کو اپنا اسوہ بنایا۔

اسوۂ حسنہ رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان ہے

اللہ تعالیٰ نے جس طرح تبلیغ احکام کیلئے آپ ﷺ کو اپنا رسول بناکر خود بھیجا تھا اسی طرح آپ کی ذات گرامی کو نمونہ اور اسوۂ حسنہ بھی خود ہی بناکر بھیجا تھا،

لہذا اس طرح آپ کے علوم کی قدرت ضامن تھی اسی طرح آپ کے اعمال وافعال کی بھی قدرت ہی خودنگران تھی اور عصمت رسول کا مفہوم بھی یہی ہے، اسوہ حسنہ کو رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان سمجھنا چاہئے۔

اب اگر رسول کے کسی قول وعمل میں معصیت کی گنجائش تسلیم کرلی جائے تو دو باتوں میں سے ایک بات ماننی لازم ہوگی، یا رسول کی ذات اسوہ نہ رہے یا معصیت بھی اسوہ کا جزء بن جائے اور امتوں کے حق میں معصیت کا یہ عمل بھی مذموم نہ رہے کیونکہ جب وہ معصیت خود قدرت کے نمونہ میں موجود ہوگی تو پھر اس کی اتباع پر امت سے بازپرس کیوں ہوگی ؟ یہ دونوں باتیں ایک لمحہ کیلئے بھی قابل تسلیم نہیں اس لئے یہی بات تسلیم کرنی ہوگی کہ رسول چونکہ معصوم ہوتا ہے اس لئے اس کے کسی عمل پر معصیت کا اطلاق نہیں ہوسکتا، اس کا ہر ہر عمل نظر ربوبیت میں حسنہ اور نیکی شمار ہوتا ہے اور نیکی بھی وہ جس کو نمونہ کہا جاسکے۔

منکرین حدیث کا عقیدہ

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن پر ختم ہوجاتا ہے، گویا ان کے نزدیک آپ کی حیثیت ایک پوسٹ مین سے زیادہ نہیں تھی (والعیاذ باللہ) اب ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم میں رسول کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے، اوپر معلوم ہوچکا کہ منصب رسالت براہ راست خدا کے انتخاب پر موقوف ہے اور یہ کہ رسالت صرف وہبی ہے بندوں کے کسب واکتساب یعنی عبادات وریاضات کو اس کے حصول میں کچھ دخل نہیں ہے، قدرت رسولوں کا انتخاب خود ہی کرتی ہے۔

قرآن کریم کی واضح آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی تعلیم و تربیت خود کرتے ہیں، وہ ان کو خود پڑھا کر خود ہی یاد بھی کراتے ہیں سنقرئک فلا تنسی ٥ الا ما شاء اللہ ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے بجز اس کے جس کو خدا چاہے، پھر اس وحی کے بیان کی ذمہ داری بھی خود ہی اٹھاتے ہیں ان علینا بیانہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام کے عواطف و میلان قلبی کی بھی نگرانی کرتے ہیں اور ان کے عزائم اور افعال، قلبی خطرات کی بھی پوری نگرانی کی جاتی ہے اس لئے امت ان کے متعلق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے لولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف جھک چلے تھے، اس ربانی تعلیم و تربیت، عصمت اور ہمہ وقت نگرانی کی وجہ سے نبی کی جوبات ہوتی ہے وہ خواہش نفس سے پاک اور صاف ہوتی ہے اور انہیں رائے کی عصمت بھی حاصل ہوتی ہے۔

ارشاد ہے وما ینطق عن الھوٰی ٥ ان ھو الا وحی یوحی ٥ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، جو بولتا ہے وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے، اور ارشاد ہے انا انزلنا علیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ہم نے آپ پر قرآن سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کو سجھائے، رسول کے سوا کسی کے ساتھ یہ وعدہ نہیں ہے کہ مخلوق میں فیصلہ کے لئے اللہ تعالیٰ خود ان میں سمجھ پیدا کر دیتا ہے، یہ رائے کی عصمت انہیں کے ساتھ

مخصوص ہے۔

آیت ومایںطق عن الھوٰی کے معنی

منکرین حدیث اس آیت کریمہ کو صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں حالانکہ یہاں رسول کی صفت نطق کی مطلقاً مدح مقصود ہے، قرآن کریم پڑھنے کے لئے تمام جگہ تلاوت یاقراءت کالفظ استعمال ہوا ہے، اگر یہاں قرآن مراد ہوتا تو ومایںطق کی جگہ ومایتلواياومايقرأ کالفظ ہوناچاہیے تھا۔

منکرین حدیث چونکہ حدیث کے سرے سے مخالف ہیں اس لئے وہ رسول کو کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف دیکھنانہیں چاہتے جس کے بعد اس کوعام امراء وحکام سے کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہوجائے۔

اصل یہ ہے کہ رسول اپنی ذات اور تمام صفات میں عام انسانوں سے ممتاز ہوتاہے اس لئے اس کے کان وہ کچھ سنتے ہیں جوعام مخلوق کے کان نہیں سنتے، اس کی آنکھ وہ دیکھتی ہے جوعام آنکھیں نہیں دیکھتیں، اسی لئے فرمایاانی اری ما لا ترون میں وہ دیکھتاہوں جوتم نہیں دیکھتے، اسی لئے آپ ﷺ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایاکہ اس منہ سے حق بات کے سوا کبھی کچھ نہیں نکلتاحتی کہ اپنی خوش طبعی کے متعلق بھی فرمایاانی لا اقول الاحقاًمیں خوش طبعی میں بھی سچی بات کہتاہوں، اسی لئے فرمایاکہ غصہ اور رضامندی کے ہرحال میں جومیرے منہ سے نکلے سب لکھ لووہ حق ہی حق ہوگا، جب اس کے عام نطق کاحال یہ ہے توجوقرآن اس کی زبان سے نکلتاہے وہ صدق وصفاکی کس منزل پرہوگا۔

یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ اس جگہ قرآن نے آپ ﷺ کے کسی خاص

بات کہنے کے متعلق صفائی پیش نہیں کی وما ینطق بالقرآن وغیرہ نہیں فرمایا بلکہ مفعول کو حذف کیا ہے بہذا بلاغت کے قاعدہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مفعول مقصود ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کی صفت نطق کی پاکیزگی بتلانا منظور ہے۔ دیکھئے تفتازانی کی وہ تقریر جو انہوں نے ھل یستوی الّذین یعلمون والّذین لایعلمون میں کی ہے۔

ورائے خواہشات نفس سے پاکیزگی اور خطرات کی اس عصمت کی وجہ سے وہ عالم کیلئے مجسم نمونہ عمل بنتے ہیں اور وہ جو بھی کہہ دیتے ہیں سب خواہشات نفس سے پاک اور جو کرتے ہیں وہ سب نیکی ہی نیکی ہوتی ہے اس لئے ان کی ہستی آنکھ بند کرکے اتباع کے قابل ہوتی ہے اور کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہوتا لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (ہر قوم کیلئے اپنے پیشوا نمونہ ہوتے ہیں) تمہارے لئے بہترین نمونہ خدا کا یہ رسول ہے۔

احترام رسول ﷺ

اتباع کے ساتھ امت پر رسول کا احترام اتنا واجب ہوتا ہے کہ اس کے سامنے آگے بڑھ کر کوئی بات کہنا ممنوع ہوتا ہے یاایھا الّذین اٰمنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ واتقوا اللہ اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اس کے سامنے اونچی آواز سے بولنا اس کو عام انسانوں کی طرح آوازیں دینا حبط عمل کا موجب ہوسکتا ہے، پڑھئے آیات ذیل:

(۱) یاایھا الّذین اٰمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیّ ولاتجھروا لہ بالقول کجھربعضکم لبعض ان تحبط

اعمالکم وانتم لا تشعرون ○ اے ایمان والو اونچی نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے ایک دوسرے کے سامنے تڑخ کر بولا کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

(۲) لا تجعلوا دعاء الرّسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا رسول کو آپس میں اس طرح مت پکارو جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

(۳) انّ الّذین ینادونک من وّراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون جو لوگ آپ کو دیوار کے باہر سے پکارتے ہیں وہ اکثر عقل نہیں رکھتے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رسول کی آواز سے اپنی آواز اونچا کرنا جب عمل کو ضائع کرنے کا موجب ہو سکتا ہے تو اس کے احکام کے سامنے اپنی رائے کو مقدم کر دینا اعمال صالحہ کے لئے کیونکر تباہ کن نہ ہوگا۔

اطاعت رسول ﷺ

رسول ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، ارشاد ہے ومن یّطع الرّسول فقد اطاع اللہ جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہنا مانا۔

آیات بالا سے رسول اللہ ﷺ کی واقعی حیثیت کا علم ہوتا ہے کہ وہ ہمہ وقت مطاع اور لازم الاتباع ہے اور اس کی اطاعت خدا تعالیٰ کی ہی اطاعت ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے اس کا ذمہ لیا ہے کہ رسول جو پڑھ کر سنائیں گے پھر اس کی جو مراد بیان کریں گے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی، جو کلمہ زبان سے نکالیں گے وہ خواہشات نفس سے قطعاً پاک ہوگا، قرآن میں جو رائے دیں گے وہ بھی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہوگی یہاں تک کہ ان کے دل میں جو خطرات بھی گذریں گے وہ بھی قدرت

کی حفاظت کے پیچھے رہیں گے۔ اس کے بعد یہ حق کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ رسول کے کلام میں اپنی جانب سے یہ تفریق پیدا کر دے کہ جو اس نے قرآن کہہ کر سنایا ہے وہ تو واجب الاطاعت ہے لیکن جو اس نے اس کی مراد بتلائی ہے یا اس نے خود فرمایا وہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ اس کو شرعی کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں۔

رسول بذات خود ایک شرعی منصب ہے، وہ آتے ہی اس لئے ہیں کہ دنیا کو ہدایت اور خدا تعالیٰ کی رضامندی کی راہ دکھلائیں، اس لئے اس بارہ میں وہ جو کہتے ہیں وہ سب رب العزت کی رسالت کی حیثیت سے کہتے ہیں، جو پہنچاتے ہیں وہ خدا ہی کا حکم ہوتا ہے، اگر قرآن کریم پہنچانا رسالت میں داخل ہے تو اس کی مراد بیان کرنا، اس کی تفصیلات سمجھانا یا دین کے بارہ میں اپنی ہی جانب سے قرآنی آیات کے ماتحت کچھ اور احکام صادر کرنا رسالت کا جزء کیوں نہیں؟

منکرین حدیث کے عقیدہ پر تبصرہ

قرآن کریم کی کسی ایک آیت میں بھی اس طرف کوئی معمولی سا بھی اشارہ نہیں ملتا کہ رسول کی یہ تمام صفات قرآن کے ساتھ خاص ہیں، یہاں تک کہ جب وہی دین کے معاملہ میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے تو اس کی حفاظت نہیں کی جاتی اور اس میں خواہش نفس کا دخل ہونے لگتا ہے اور اس وقت اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں رہتی (العیاذ باللہ)

اب ایک طرف آپ ان آیات قرآنیہ کو پڑھئے دوسری طرف منکرین حدیث کا یہ مذکور عقیدہ دیکھئے کہ صرف قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، ان کے اعتقاد پر قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ لینے کے بعد اب وہ اور ہم (نعوذ باللہ)

برابر ہیں، جیسا وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں، دین کے معاملات میں ان کی رائے کا وزن وہی ہے جو ہماری رائے کا۔

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ رسول اپنی زندگی کے طویل وعریض عرصات میں بہت ہی مختصر لمحات کیلئے منصب رسالت پر مامور ہوتا ہے، بقیہ زندگی میں اس کی حیثیت پھر وہی ہو جاتی ہے جو عام انسانوں کی ہے، لیکن ان آیات سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے لئے اتباع اور اطاعت کا حق اور اس کے یہ آداب وعظمتیں کسی وقت کے ساتھ خاص ہیں بلکہ اس کا جو احترام تبلیغ قرآن کے وقت واجب ہے وہی تدبیر مہات اور فصل خصومات اور امت کے دوسرے نظم ونسق کے وقت واجب ہوتا ہے۔ پس جب اس کا احترام ہمہ وقت واجب ہے تو یہی ماننا پڑے گا کہ وہ ہروقت رسول ہے، اور جب ہمہ وقت رسول ہے تو دین کے معاملہ میں اس کا جو حکم ہے وہ ہمہ وقت واجب الاطاعت ہے۔

قرآن کریم میں رسول ﷺ کی اطاعت

رسول کی اطاعت مستقل حیثیت سے بھی واجب ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے اطیعوا اللہ واطیعوا الرّسول واولی الامرمنکم فان تنازعتم فی شیء فردّ وہ الی اللہ والرّسول فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں حکم کے مالک ہوں (یعنی حکام وغیرہ) پھر اگر تم کسی بات میں جھگڑ پڑو تو اسے خدا اور رسول کے سامنے پیش کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اطاعتیں واجب فرمائی ہیں، دو مستقل اور ایک غیر مستقل، اللہ اور رسول کی اطاعت تو مستقل واجب کی گئی ہے اور

''اولوا الامر'' کی تیسری اطاعت ان دونوں اطاعتوں کے ماتحت درج کردی گئی ہے ، اسی لئے پہلی دو اطاعتوں کیلئے لفظ اطیعوا (فرمانبرداری کرو) مکرر استعمال کیا گیا ہے اور تیسری اطاعت کے لئے جداگانہ امر نہیں فرمایا گیا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں رسول کی اطاعت خدا تعالیٰ کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ''اولوا الامر'' کی اطاعت ان اطاعتوں کی طرح مستقل حیثیت نہیں، یہی وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ کے حکم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے کبھی آپ ﷺ سے اس پر قرآن سے دلیل کے پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہو، اس کے برخلاف اماموں کو ہمیشہ اپنی اطاعت کیلئے قرآن وحدیث کے پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ، بلکہ بعض مرتبہ ان کو اپنے قول سے رجوع بھی کرنا پڑتا ہے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآنی امر میں تشریعی حیثیت کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے اس لئے یہاں رسول ﷺ کی اطاعت بھی صرف تشریعی حیثیت سے واجب ہوگی نہ کسی اور حیثیت سے۔

اطاعتِ رسول ﷺ کے مستقل ہونے کی توضیح

اطاعت رسول ﷺ کے مستقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ہر حکم ماننا چاہیئے خواہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے ، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض سنتوں کی اصل قرآن میں موجود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول کی اطاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اسکی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے ، اور اولوا الامر کی اطاعت اس طرح واجب نہیں

ہے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے ماتحت ہے اس لئے جب تک وہ احکامِ خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق حکم دیں ان کی اطاعت کی جائے گی اور جب ان کے خلاف کریں واجب الاطاعت نہ رہیں گے، صحیح حدیث میں ہے لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے انما الطاعة في المعروف اطاعت صرف نیکی میں کرنی چاہئے۔

اس بیان سے اطاعت رسول کے مستقل اور ''اولوالامر'' کی اطاعت کے غیر مستقل ہونے کا مفہوم واضح ہوگیا، اگر رسول کی اطاعت صرف ان احکام تک ہی محدود رہے جو قرآن کریم میں بھی صاف صاف موجود ہیں تو پھر واطیعوا الرسول کی آیت کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا، اطیعوا اللہ واطیعوا الرّسول (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی) کی آیت یہ چاہتی ہے کہ خدا کے نزدیک رسول کی اطاعت بھی ایک مستقل لاء ہے۔

منکرین حدیث کو مغالطہ

یہاں منکرین حدیث کو بڑا مغالطہ یہ ہوگیا ہے کہ وہ دو اطاعتوں کی وجہ سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ مطاع بھی دو بن گئے، اس لئے یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دو اطاعتوں کے واجب ہونے کی وجہ سے مطاع دو نہیں بنتے، دراصل مطاع دونوں جگہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے، رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع خدا کی ذات پاک نہیں ہوتی بڑی غلط فہمی اور قرآن کریم سے ناواقفی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے من یّطع الرّسول فقد اطاع اللہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی

اطاعت کی، گویا رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے، پس اطاعت کے تعدد سے مطاع میں تعدد نہ سمجھنا چاہئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا بیان اس لحاظ سے کہ اس تفصیل سے قرآن مجید میں مذکور نہیں ہوتا ایک مستقل حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور اس اعتبار سے یہاں مطاع بظاہر رسول کی ذات معلوم ہوتی ہے، اور اگر یہ لحاظ کیا جائے کہ یہ تمام تفصیل بعینہٖ قرآن کے اجمال کی مراد ہوتی ہے تو اس کی حیثیت کوئی مستقل حیثیت نہیں رہتی اور یہاں بھی اصل مطاع خدا ہی کی ذات ہوجاتی ہے، اس لئے احادیث رسول پر عمل کرنے والا بلحاظ بیان تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے اور بلحاظ مراد خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والا خدا کے الفاظ پر بھی عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے، اس بنا پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع درحقیقت ایک ہی رہتا ہے۔

پیچیدہ مسئلہ کا حل

درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی نازک توحید خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے رسول کی محبت واطاعت کا بھی حکم دیتی ہے، قرآن کریم نے بتایا کہ نسبت رسالت کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف واسطہ ہوتی ہے، پھر اس کی اطاعت ومحبت خدا ہی کی محبت واطاعت ہوجاتی ہے، چنانچہ ارشاد ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ یعنی اصل حکم برداری تو خدا ہی کی چاہئے ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکم برداری

ہوتی ہے، بلکہ رسول کی اطاعت ومحبت کے بغیر خدا کی محبت واطاعت کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

امام کی اطاعت کو بعینہٖ خدا اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جا سکتا

رسول کی اطاعت چونکہ خداتعالیٰ کے بیان اور اس کی اراءۃ، اس کی وحی کے بعد ہوتی ہے اس لئے اس کو بعینہٖ خدا کی اطاعت کہا گیا ہے، امام پر نہ وحی آتی ہے، نہ خدا کی طرف سے اس کی صواب رسی کی کوئی ضمانت دی گئی، وہ جو حکم دیتا ہے اپنی صوابدید، اپنی فہم، اپنے علم کے مطابق دیتا ہے، اس لئے امام کی اطاعت کو بعینہٖ خدا اور رسول کی اطاعت کہنا بھی غلط ہے اور اس لئے منکرین حدیث کا یہ کہنا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے قرآن میں امام وقت کی اطاعت مراد لی گئی ہے سب سے بڑھ کر قرآن کریم کی تحریف ہے۔

اس کے علاوہ امام سے ہر امام مراد ہو تو فاسق امام کی اطاعت کو بھی اللہ ورسول کی اطاعت کہا جا سکے گا، اور اگر خاص صالح امام مراد لیا جائے تو خلفائے راشدین کے بعد تیرہ سو سال میں خدا اور رسول کی اطاعت کا مصداق ہی شاذ و نادر ہوگا، پھر جس دور میں مسلمانوں کا کوئی امام ہی نہ رہے اس میں لازم آئے گا کہ خدا اور رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے اور اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کا نظام معطل پڑا رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی بے شمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اطاعت خدا اور رسول میں منحصر ہے، اب اگر اس اطاعت سے مراد امام کی اطاعت ہو تو یقیناً تیرہ سو سال میں اماموں کی بڑی تعداد ایسی ہی ہے

جن کی اطاعت کواللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکتا، منکرین حدیث کے مطابق لازم آتا ہے کہ اس عام دور میں مسلمانوں کے لئے راہ نجات وہدایت مسدود ہو اور مسلمانوں کے پاس اپنے باہمی نزاعات رفع کرنے کی کوئی صورت ہی موجود نہ ہو، گویا دین اسلام ایک ایسا آئین ہو جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہو۔

منکرین حدیث کا بحیثیت رسالت رسول کی اطاعت کا انکار کرنا

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں، رسالت اور امامت، رسالت کی حیثیت سے آپ ﷺ پر صرف ایمان لانا ضروری تھا اور آپ کی اطاعت کرنا بہ حیثیت امامت تھا نہ کہ بہ حیثیت رسالت، مگر یہ بات واقعات کے بھی خلاف ہے اور خود قرآن کے بھی خلاف ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام امت مسلمہ نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپ ﷺ کے ساتھ دو قسم کا برتاؤ نہیں کیا اور نہ ہی قرآن کریم نے کہیں ان دو حیثیتوں کا جدا جدا اعتبار کرکے آپ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں قرآن مجید میں ارشاد ہے ما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لہم الخیرة من امرھم جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کردیں تو کسی مومن مرد یا عورت کو پھر اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اس آیت میں آپ ﷺ کو رسول کہہ کر بحیثیت رسول آپ کے فیصلہ اور خداتعالیٰ کے فیصلہ کو ایک ہی قرار دیا گیا ہے اور آپ کے فیصلہ کا یہ حق بتایا گیا ہے کہ اب اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، اس کی اطاعت فرض ہوجاتی ہے، پس منکرین حدیث نے جو دو حیثیتیں بیان کرکے ان کے لحاظ سے رسول کے

بحیثیت رسول مطاع ہونے کا انکار کیا ہے یہ قرآن کے صریح مخالف ہے، قرآن نے نہ صرف یہ کہ رسول کے بحیثیت رسول مطاع ہونے کا اعلان فرمایا بلکہ ہر رسول کی رسالت کا مقصد ہی یہ بتلایا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، ارشاد ہے وما ارسلنا من رسول الآ لیطاع باذن اللہ ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم کے ماتحت ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔

معلوم ہوا کہ رسولوں کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالیٰ کا مستمر قانون ہے، قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لئے بنایا گیا ہے، اس لئے رسولوں کا مطاع ہونا قرآن کے نزدیک حق رسالت ہے اور ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا۔

اب اگر رسول بحیثیت رسول مطاع نہ سمجھا جائے تو اس صورت میں رسالت کی غرض ہی فوت ہو جائے اور بعثت رسل بے مقصد قرار پائے، منکرین حدیث کا رسول کو بحیثیت رسول مطاع نہ سمجھنا قرآن کے کتنا مخالف ہے، قرآن تو کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لئے مبعوث ہوا ہے اور منکرین حدیث کہتے ہیں کہ کوئی رسول اطاعت کیلئے نہیں آیا صرف ایمان کیلئے آیا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب سے پہلے بعد کتاب اللہ کے آنحضرت ﷺ کی سنت ہی تلاش کیا کرتے تھے، اگر وہ نہ ملتی تو اس کے بعد اپنی جانب سے جو سمجھ میں آتا فیصلہ کرتے اور اگر اس کے بعد بھی آپ کی سنت ہاتھ آجاتی تو اسی کا اتباع کرتے اور اپنے قول سے رجوع کر لیتے، اگر بقول منکرین حدیث آنحضرت ﷺ کی حیثیت ان کی نظر میں صرف ایک امام کی حیثیت

ہوتی تو وہ آپ کی اطاعت صرف آپ کے زمانۂ حیات سے وابستہ سمجھتے اور اس کے بعد ان کے نزدیک آپ کے قضا اور فیصلوں کی حیثیت ایک عدالت کے فیصلے سے زیادہ نہ رہتی اور جس طرح ایک خلیفہ کا فیصلہ دوسرے کیلئے حجت نہیں ہوتا اس کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ موافقت کرے یا مخالفت یہی حیثیت آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کے فیصلوں کی ہوتی ،مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تمام تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتایا جاسکتا جہاں کسی صحابی نے آنحضرت ﷺ کا کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ سنا ہو اور اس کے ثبوت کے بعد پھر اس کے خلاف فیصلہ کرنے کا اپنے دل میں خطرہ بھی محسوس کیا ہو۔

رسول کی اطاعت وفات کے بعد بھی حالت حیات کی طرح ہے

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی اطاعت بحیثیت رسول کرتے تھے نہ کہ صرف بحیثیت امامت ، اور یہ کہ ان کے درمیان آپ کی حیثیت آپ کی وفات کے بعد بھی وہی تھی جو آپ کی حیات میں تھی ، دونوں حالتوں میں وہ آپ ہی کا فیصلہ تلاش کرتے تھے اور جب آپ کا فیصلہ انہیں مل جاتا تھا تو دونوں حالتوں میں اس پر راضی ہوجاتا اور اس کے خلاف میں اختیار باقی نہ رہنا بالکل یکساں سمجھتے تھے ، یہ ہرگز ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کسی ایک متنفس نے بھی آپ کی اطاعت میں زندگی اور وفات کے بعد ایک ذرہ برابر بھی کبھی فرق کیا ہو۔

ان کے نزدیک جس طرح رسول کی وفات سے اس پر ایمان لانے میں کوئی فرق نہیں ہوا اسی طرح اس کے احکام کی اطاعت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا حق

بات یہ ہے کہ آپ نبوت سے سرفرازی کے بعدیوم وفات کے ایک ایک لمحہ تک کبھی حیثیت رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے، ہمیشہ آپ پر ایمان، آپ کی اطاعت، آپ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اورآج بھی آپ پر ایمان، آپ کی اطاعت اورآپ کا احترام اسی منصب رسالت کے اعتبار سے ہے اور تاقیامت اسی حیثیت سے کیا جاتا رہے گا، اس کے خلاف جوکچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے۔

قرآن کے لیئے رسول کی ضرورت

ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ اورمعانی دونوں کیلئے رسول کی ضرورت ہے، جو شخص رسول کی احادیث سے مستغنی ہوناچاہتا ہے اور محض اپنی عقل سے قرآن کی تشریحات کرتا ہے وہ درحقیقت کتاب اللہ کے ساتھ آئین سازی میں شرکت کا مدعی ہے، اورجو شخص اپنے فیصلوں کورسول کے فیصلہ کے ہم پلہ سمجھتا ہے وہ درحقیقت رسول کا منکر ہے بلکہ رسالت کی ضرورت کا منکر ہے۔

کتاب اللہ کی عملی تشکیل بھی رسول کے فرائض میں سے ہے

حالانکہ قرآن کریم کواپنی تلاوت کے ابتدائی مرحلہ سے لے کراپنی مرادکی تعیین اور عمل کی تشکیل کے ایک ایک گوشہ تک رسول کی احتیاج ہے، رسول کی ضرورت صرف اتنی بات کیلئے نہیں ہوئی کہ وہ خدا کی کتاب ہم تک پہنچادیں بلکہ اس سے بڑھ کر کتاب اللہ کی تعلیم، اس کا بیان اوراس کی عملی تشکیل بھی اس کے فرائض میں سے ہے، اسی لئے حدیث یعنی بیان رسول کاانکاراوررسول کاانکارایک ہی مسئلہ ہے۔

ناقابل فراموش بات

یہ بات فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جو شخص رسول کا صحیح مقام نہیں پہچانتا، اس کی عظمت اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا وہ بھی رسولوں کے منکرین ہی کی صف میں شامل ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایک صاف منکر ہے اور ایک اقراری منکر ہے۔

ایک اہم سوال

منکرین حدیث سے یہ سوال بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ رسالت اور امامت کی دو حیثیتوں کی تقسیم کے بعد یہ بتلایا جائے کہ اسوۂ رسول کی پیروی کس حیثیت سے ہے، اگر حیثیت رسالت سے ہو تو اطاعت اس کا حق نہیں، اس حیثیت سے رسول کا حق صرف اس پر ایمان لانا ہے، اور اگر بحیثیت امامت قرار دی جائے تو پھر اسوۂ رسول ہی کی خصوصیت کیا ہے ہر امام اسوۂ حجت بن سکے گا، اور اگر یہ کہا جائے کہ اسوۂ رسول بعینہٖ قرآن پاک ہے لہذا اس کی اطاعت قرآن کی اطاعت میں درج ہے تو یہ بتانا چاہئے کہ جب کتاب اللہ اور اسوۂ رسول میں کوئی فرق ہی نہیں تھا تو پھر قرآن کے بعد اسوۂ رسول کی ضرورت کیا تھی، اور اگر اس اسوہ میں کچھ تفصیلات قرآن سے زیادہ تھیں تو پھر اس زیادہ میں رسول کی اطاعت کا جواب دیا جائے کہ وہ کس حیثیت سے ہے؟ رسالت کی حیثیت سے اطاعت واجب ہی نہیں ہو سکی اور امامت کی حیثیت اسوہ بننے کے قابل نہیں ہے۔

پھر امامت و رسالت کے حقوق میں بھی تضاد ہے، رسول پر بقول منکرین حدیث صرف ایمان لانا واجب ہے مگر امام پر ایمان نہ لانا ضروری ہے، رسول ﷺ بیک وقت لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے تھے اور اس وقت اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے مگر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کبھی آپ نے اپنے ان دو متضاد حقوق کو اپنے

مختلف منصبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی تنبیہ کی ہو، پھر اس وقت ان اُمّی مخاطبین کیلئے جنہوں نے منطق کا کوئی چھوٹا سا چھوٹا رسالہ بھی نہیں پڑھا تھا یہ تقسیم کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ جدا جدا ملحوظ رکھیں، جب محمد عربی ﷺ بہ حیثیت رسول فائز ہوں تو ان پر فوراً ایمان لے آئیں اور جب بہ حیثیت امام نمودار ہوں تو انکار کردیں اور کہہ دیں کہ یہ انکار بہ حیثیت امامت ہے نہ بہ حیثیت رسالت، یا یہ اطاعت بہ حیثیت امامت ہے نہ بہ حیثیت رسالت، یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو مقام رسالت کے صحیح طور پر سمجھنے اور اس کے حقوق اطاعت و عظمت اور محبت کے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین بحرمۃ سید المرسلین وآلہ و اصحابہ اجمعین۔

۲۲ / ربیع الثانی ۱۱ ھ بوقت ضحیٰ پنج شنبہ